JUNE

ماہنامہ تجلّی دیوبند

ایڈیٹر
عامر عثمانی

Rs. 1/50

سالانہ پندرہ روپے

تاجر حضرات
قواعد ایجنسی
طلب فرمائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے۔ یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔ وی پی ساڑھے سولہ روپے کا ہوگا۔ منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

جون ۷۳ء

ماہنامہ تجلّی دیوبند

ایڈیٹر: عامر عثمانی

پچیسویں سال کا تیسرا شمارہ

امریکہ۔ انگلینڈ۔ نائجیریا۔ کنیڈا فرانس۔ برمنگھم۔ انڈونیشیا اور ملیشیا سے بذریعہ بحری ڈاک دو پونڈ، بذریعہ ہوائی ڈاک ۵ پونڈ۔

بحرین افریقہ۔ سعودی عرب۔ قطر وغیرہ سے بذریعہ بحری ڈاک ایک پونڈ اور دس شلنگ۔ بذریعہ ہوائی ڈاک تین پونڈ۔

ھندوستان سے:۔ سالانہ پندرہ روپے

فہرست ماہ جون ۷۳ء

آغاز سخن	عامر عثمانی	۵
تجلّی کی ڈاک	ر	19
دعائیں وسیلہ	ر	۳۱
شاہنامۂ اسلام (جدید)	ر	۴۳
تفہیم القرآن پر چند اعتراضات	ر	۵۱
تفسیر ماجدی (جلد دوم)	ر	۷۵
کارکنوں سے مولانا مودودی کا خطاب	(ماہنامہ زندگی لاہور)	۸۳
مسجد سے میخانے تک	ملّا ابن العرب مکّی	۹۲

فی پرچہ ــــ ڈیڑھ روپیہ

اسلامی پریس۔ دیوبند

احوال واقعی

لیجئے - آخرکار اللہ کے فضل سے وہ وقت آہی گیا کہ ہم "ایمان نمبر" کے وقتِ اشاعت کا مژدہ آپ کو سنا سکیں۔ تجلی نے اب تک جتنے بھی خاص نمبر شائع کئے ہیں اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ انھیں قبولِ عام اور وزن حاصل ہوا ہے۔ ضخامت بڑھانے کی فکر سے زیادہ ہم مواد بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور مواد میں بھی ہماری کوشش یہ رہتی ہے کہ انتہائی تحقیق وتفحص پر مبنی ہو اور قرآن و سنت کی صحیح ترجمانی اس سے ہو سکے۔ علم وتحقیق کو اس طرح پیش کرنا کہ عوام الناس بھی دلچسپی سے پڑھ اور سمجھ سکیں خاصا دشوار کام ہے لیکن خدا ہی کا احسان واکرام ہے کہ اس نے اس دشواری کو بھی ہمارے لئے سہل بنا دیا ہے اور تجلی کی قبولیت خواص وعوام دونوں میں ہے۔ آنے والا ایمان نمبر بھی انشاء اللہ ہر دو خصوصیت کا حامل ہوگا۔ یعنی مواد نہایت تحقیقی اور علمی مگر زبان سلیس وشگفتہ۔

اگلا شمارہ **ایمان نمبر** ہوگا

جو انشاء اللہ جولائی کے آخری ہفتے میں آپ کو مل جائے گا

جھلکیاں

• آغازِ سخن:- ایمان کے تمام علمی وعملی گوشوں پر سیر حاصل گفتگو۔ علمائے سلف کی بہترین کاوشوں کا نچوڑ۔

• ایمان کے اثرات فرد کی زندگی پر • ایمان اور استقامت

• ایمان اور حیاتِ اجتماعی • اسلام میں صدقہ واحسان کی اہمیت

• اسلام میں تحریمِ اشیاء اور اس کی حکمت

تجلّی کی دیگر دلچسپیاں اور افادی کالم بدستور۔ تجلّی کی ڈاک۔ شاہنامہ۔ تنقیدات۔ مسجد سے میخانے تک۔ کھرے کھوٹے۔

قیمت تین روپے ہوگی۔ سالانہ خریداروں سے الگ قیمت نہیں لی جائے گی البتہ جو خریدار یہ چاہیں کہ ڈاک میں گم ہونے کا اندیشہ نہ رہے' وہ رجسٹری کے لئے ڈیڑھ روپیہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔

منیجر تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

آغازِ سخن

ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ علمائے دیوبند کے یہاں میلاد النبی کے جلسوں اور ہنگاموں کے بدعت ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ بہتیرے رسائل اور کتبِ فتاویٰ میں ان کے واضح فیصلے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

لیکن اب صورتِ حال پہلے سے مختلف ہے۔ تحریراً تو شاید آج بھی کوئی ممتاز دیوبندی عالم یہ فتویٰ نہ دے کہ میلاد بدعت نہیں ہے۔ مگر عملاً ان حضرات نے اپنے پیش رووں کے موقف و مسلک پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے اور جلسۂ میلاد کو "جلسۂ سیرت" کا نام دے کر بڑی بے تکلفی سے اس کی سرپرستی فرما رہے ہیں چنانچہ دار العلوم دیوبند کے متعدد علماء و اساتذہ ماہ ربیع الاول میں ہونے والے سیرت کے جلسوں میں دُور دُور جاتے ہیں اور خود دیوبند میں ایک عربی مدرسہ والے ہر سال اس طرح کے جلسے منعقد کراتے ہیں اور متعدد اساتذۂ دار العلوم اس کے اسٹیج سے تقریریں کرتے ہیں۔

بعض تجدد پسند حضرات کا یہ علم کلام آپ نے بھی سنا ہوگا کہ قرآن میں جس شراب کو حرام کہا گیا ہے اس کا نام وھسکی اور بیئر اور شیمپین تو نہ تھا لہٰذا ان جدید مشروبات کی حرمت قرآن سے کیسے ثابت ہوسکتی ہے نیز جس سود کو قرآن نے ممنوع قرار دیا ہے وہ یقیناً حرام ہی ہے لیکن آج کے بینکنگ کو اس سے کیا تعلق بینکنگ کے واسطے سے جو نفع ملتا ہے وہ تو انٹرسٹ ہے۔ پرافٹ ہے۔ بھلا اسے کیونکر ممنوع کہہ سکیں گے۔

یہ علم کلام اگر قابلِ قبول ہے تو بے شک میلاد النبیؐ کے ہنگاموں کو "سیرت النبیؐ" کا عنوان دے کر داخلِ حسنات کرنا بھی قابلِ قبول ہے جیسا کہ ہمارے بعض ہم عصر علمائے دیوبند کر رہے ہیں۔ لیکن اگر یہ استدلال کاسد و فاسد ہے تو پھر اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ نام سیرت النبیؐ رکھیئے یا عید میلاد النبیؐ یا کچھ اور یہ ماہ ربیع الاول کے ہنگامے ہر حال میں بدعت ہی ہیں اور جو علمائے دیوبند اس کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی فرما رہے ہیں وہ عوامی رجحان کے تابع ہو کر اپنے مسلکِ صحیحہ سے دو

ہیں۔

کیا ٹھکانا ہے اس قوم کی تیرہ بختی کا جو عین تعظیم رسولؐ کے نام پر دین وشریعت کے مسلّمات کا مذاق اڑائے اور کھلی ناز یبا حرکات کو اچھے اچھے نام دے۔ ابھی لکھنؤ میں عیدِ میلاد النبیؐ کے نام پر جو کچھ ہو چکا ہے اسکا تھوڑا سا حال مستند شاہدین کی زبانی آپ بھی سن لیجئے:۔

"امسال عید میلاد النبیؐ پر تنہا لکھنؤ میں جو چراغاں کیا گیا اور آرائش ہوئی اس پر مصارف کا محتاط اندازہ دس بارہ لاکھ ہے۔ ایک مقامی اخبار کی رپورٹ کے مطابق بیس ہزار ٹیوب لائٹ اور لاکھوں قمقمے لگا کر شہر کو بقعۂ نور بنا دیا گیا تھا۔ روشنی کا ایک سیلاب تھا جو ۱۲ ربیع الاوّل کی شب کو شہر میں رواں تھا۔ بجلی کے بلب ٹیوب لائٹ، محرابوں اور شامیانوں کے لئے بانس اور بلیاں لکھنؤ میں ختم ہو گئیں تو بارہ بنکی، کانپور وغیرہ اطراف کے شہروں سے درآمد کی گئیں۔" (تعمیر حیات۔ لکھنؤ۔ ۲۵ر اپریل ۷۳ء)

"پورے شہر میں چراغاں کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں اور رنگوں کی رونق اور بھیڑ کی یہ کیفیت کہ دیوالی کی رونقیں اور قومی تیوہاروں کی سجاوٹ اس کے سامنے ماند پڑ جائے۔" (عزائم۔ لکھنؤ۔۔۔)

"تماشائی کو اب کی بار ہجوم میں عورتوں کی کثرت بڑی فکر انگیز محسوس ہوئی۔ یہ عورتیں ہر مذہب وملت سے تعلق رکھتی تھیں اور سیر سپاٹے کے سے انداز اور تیوہار کی سی تیاریوں کے ساتھ ایسے ہجوم میں بہہ رہی تھیں جو بلا مبالغہ طغیانی پر آئے ہوئے دریا کی مانند رواں دواں تھا۔ (عزائم ر)

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ شریعت کے خلاف نام نہاد عاشقانِ رسولؐ کی جرأت وجسارت کا حال اب یہ ہو گیا ہے کہ بلا تکلف وہ اس سالانہ تقریب کو مسلمانوں کا سب سے بڑا تیوہار کہنے لگے ہیں۔ حالانکہ بڑا تو کیا یہ سرے سے کوئی تیوہار ہی نہیں اور جو لوگ اس کا رشتہ اسلام سے جوڑتے ہیں وہ دراصل دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جملہ صحابہ اور جملہ تابعین اور جملہ مفسرین ومحدثین اور جملہ مجتہدین اسلام کے پورے مقتضیات اور شریعت کے تمام مضمرات سے واقف نہ تھے۔ انھیں کبھی توفیق نہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جشنِ ولادت منائیں، وہ کم عقل تھے کہ ایک مقدس تقریب کی افادیت کا ادراک نہ کر سکے اور آخر کار آج ہم عقل مند لوگوں نے اس خامی کو دور کیا ہے۔ اِس خلا کو پُر کیا ہے۔ اس غلطی کی تصحیح کی ہے۔ ہم صحابہ اور ائمہ سے بڑھ کر دین کو جاننے والے اور رسولؐ سے عشق کرنے والے ہیں۔

ہندوستان تیوہاروں کا ملک ہے۔ ہونا بھی چاہئیے۔ جو دھرم رسوم ورواج ہی سے عبارت ہو، اور زندگی کے لئے کوئی جامع تصورِ حیات نہ رکھتا ہو وہ اگر تیوہاروں اور تقریبوں اور میلوں سے دلچسپی نہ رکھے تو آخر اپنے مذہبی جذبات کو کن شکلوں اور ہیئتوں میں ظاہر کرے۔۔ اس کے جذبات کا مظاہر تو یہی چیزیں ہیں۔ اس کا کلچر اسی فریم میں اپنی تصویر سجائے ہوئے ہے۔ اسے اس نوع کی سرگرمیوں سے جتنا بھی شغف ہو وہ قدرتی اور طبعی ہے۔

لیکن بدنصیب مسلمانوں نے بھی دانستہ اور نادانستہ ماحول سے متاثر ہو کر ایسی ہی آئیڈیالوجی قبول کر لی ہے۔ وہ بھی اسی ڈھنگ سے سوچنے لگے ہیں جس ڈھنگ سے کسی ایسی قوم کو سوچنا چاہئیے جس کے پاس فقط مذہب ہو دین نہ ہو۔ دھرم ہو شریعت نہ ہو۔ منتشر روایات ہوں منضبط نظامِ حیات نہ ہو۔

عوام بےچاروں کا قصور نہیں۔ وہ تو ہوتے ہی ہیں سطحی اور جذباتی۔ جب جبّہ ودستار والے اربابِ ریش نے "میلاد النبیؐ" کو عین دین وایمان باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور جذباتی اشتعال انگیزی کے ذریعے

ان لوگوں کو بدعقیدہ اور دشمنِ رسول صلعم ٹھیرانے میں کسر نہیں چھوڑی جو اس بدعت پر ٹوکنے کی جرأت کر رہے تھے تو عوام کی کثیر تعداد کیوں نہ یقین کر لیتی کہ میلادالنبی صلعم جیسی مقدس چیز کو بدعت قرار دینے والے گمراہ ہیں اور میلاد کو ایک جشن کی طرح منانا عین اسلام ہے۔

حال یہ ہو چکا ہے کہ بعض وہ اخبارات و رسائل بھی جو میلاد کی سال بہ سال تقریب کو عقیدۃً بدعت ہی مانتے ہیں خیر سے ماہ ربیع الاوّل میں ایک عدد "سیرت نمبر" شائع کرنا نہیں بھولتے اور اس طرح فی الحقیقت وہ بھی اپنا وزن اہلِ بدعت ہی کے پلڑے میں ڈالدیتے ہیں۔

مثلاً جماعتِ اسلامی کا اخبار "دعوت" کیا مجال ہے "سیرت نمبر" سے چوک جائے۔ حالانکہ سیرت نمبر سال کے کسی اور مہینے میں بھی نکالا جا سکتا ہے مگر عوام تو سیرت کا مطلب بس "میلاد" سمجھتے ہیں۔ وہ میلاد جس میں عجائبات و معجزات کے قصّے ہوں۔ روشنیاں اور رونقیں ہوں۔ شاعرانہ اور بعض حالتوں میں رندانہ ہُو حق ہو۔ لہٰذا کسی اور مہینے میں "سیرت نمبر" نکال کر عوام کی توجہات کیسے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

جماعتِ اسلامی جس مودودی نے بنائی تھی وہ بھی ایک پرچہ نکالتا ہے — "ترجمانُ القرآن" آج تک نہیں دیکھا کہ کسی ربیع الاوّل میں اس کا سیرت نمبر نکلا ہو۔ اس کے برخلاف دعوت کا سیرت نمبر آج تک کسی سال ناغہ ہی نہیں ہوا۔ یہ کیا ہے اگر دین و عقیدے کی استقامت پر کاروباری ذہن کو فوقیت دینا نہیں۔ جماعتِ اسلامی ہند والے ہمیں معاف کریں اگر ہم صفائی کے ساتھ یہ کڑوی بات کہدیں کہ دعوت کے "سیرت نمبر" میں چاہے کچھ بھی لکھدیا جائے — چاہے الف سے یا تک قرآن ہی کیوں نہ نقل کر دیا جائے مگر ماہِ ربیع الاوّل میں سال بہ سال سیرت نمبر نکالنا بجائے خود ثبوت ہے بھیڑ اچال کا — عوامی جذبات کے اتباع کا۔ بدعت کی حوصلہ افزائی اور ہم نوائی کا۔ لوگ کیوں نہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ جب جماعتِ اسلامی جیسی جماعت بھی عیدِ میلاد میں شرکت ضروری خیال کرتی ہے اور ایک خصوصی نمبر پیش کر کے باقاعدہ اسے مناتی ہے تو یہ یقیناً ایک تقریبِ سعید ہے اور اسے بدعت قرار دینے والے دشمنِ رسول صلعم ہیں۔

ہیہات۔ جماعتِ اسلامی کا اسوہ تو قرآن و سنت کے احکام اور تقاضوں کا ترجمان ہونا چاہیئے تھا۔ اسے تو کسی حال میں بھی خلافِ شرع رسم و رواج اور اسراف و تبذیر سے لبریز تقریبات کا ساتھ نہیں دینا چاہئے تھا۔ وہ بھی اگر ہر سال بالالتزام ایک ایسا "سیرت نمبر" عوام کی نذر کرتی ہے جس میں اشتہارات اصل مواد سے زیادہ ہوں، اور اس کا ورق ورق کاروباری ذہن کی ترجمانی کرنے والا ہو تو بتائیے کسی اور کا شکوہ کیا کیا جائے اور کن لفظوں میں کیا جائے۔

جذباتی غلو اور ذہنی بگاڑ کا اندازہ کرنے کیلئے ایک تازہ قضیہ سننے کے لائق ہے۔ بنگلور سے نکلنے والے ہفت روزہ "نشیمن" کا نام آپ بھی جانتے ہوں گے اس میں ایک کالم کا عنوان ہے "ٹھیٹر اخیں"۔ اس عنوان کی عدم ثقاہت سے بحث نہیں۔ یہ بھی ہم نہیں کہتے کہ اس پرچے کے دینی مضامین زبان اور اسلوب کے اعتبار سے بے داغ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ بدعات و خرافات کے محاذ پر یہ عموماً صحیح نقطۂ نظر کا ابلاغ کرتا ہے۔ ہم نے جب بھی اس کے غیر سیاسی مضامین پر نظر ڈالی ہے ان میں بہت سی کام کی باتیں پائی ہیں یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں اندازِ تحریر بگڑ جاتا ہو۔

بہرحال اسی نشیمن کے ۸؍ اپریل والے شمارے میں ٹھیٹر اخوں کے کالم میں میلاد پر مضمون شائع ہوا۔ اسے ہم اگرچہ اپریل میں نہ پڑھ سکے لیکن مئی میں بعض لوگوں نے پڑھوا ہی دیا۔ پر بعض لوگ وہ ہیں جو یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ تجلّی جو بھی رائے ظاہر کرے گا بے لاگ ہو گی چنانچہ انھوں نے

نہ صرف یہ شمارہ بلکہ بہت سے ان اخبارات کے تراشے بھی ہمیں بھیجے جنھوں نے اس مضمون پر بڑی لے دے کی ہے اور جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس مضمون کے خلاف بڑا شور و غل مچایا گیا ہے۔

ہمیں حیرت اس پر نہیں کہ لوگوں نے شدید احتجاج کیا اور جگہ جگہ نشیمن کی کاپیاں جلائی گئیں۔ نہ اس پر حیرت ہے کہ دفتر کو آگ لگانے کی دھمکی دی گئی۔ نہ اس پر حیرت ہے کہ حکومت سے نشیمن ضبط کرنے کی درخواست کی گئی نہ اس پر حیرت ہے کہ بڑے بڑے مخالفانہ جلسے ہوئے اور نہ اس پر حیرت ہے کہ مدیرِ نشیمن کو موہنِ رسولؐ اور دشمنِ صحابہؓ اور بددین و منافق اور خدا جانے کیا کیا کہا گیا حیرت کیوں ہو جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے بے شمار بھائی جہل اور جذباتیت میں گرفتار ہیں۔ غلو انکا اوڑھنا اور بزم آرائی ان کا بچھونا ہے اور دینی اُمور و مسائل میں وہ عموماً کھیل کود والے ذہن سے سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

لیکن حیرت اس پر ہے کہ مدیرِ نشیمن نے بھرے جلسے میں اس مضمون پر معافی مانگ لی اور خود نشیمن میں انکا معافی نامہ ہم خود بھی پڑھ چکے ہیں۔

خطا پر معافی چاہنا عیب و گناہ نہیں بلکہ شرافت و حق پرستی کے عین مطابق ہے۔ ہم مدیرِ نشیمن کو انکی معافی طلبی پر مبارکباد پیش کرتے اگر واقعی ان کے مضمون میں وہ عیوب پائے جا رہے ہوتے جن کی دہائی مخالف حضرات دے رہے ہیں لیکن ہم نے پورا مضمون دو بار غور سے پڑھا۔ ایک ایک فقرے کو جانچا لفظ لفظ کو میزانِ علم و تفقہ میں تولا لیکن ہمیں تو سوائے اس کے کچھ پتا چلا نہیں کہ پورا مضمون قرآن و سنت کے اعتبار سے صحیح نقطۂ نظر پر مشتمل ہے اور ٹھیک وہی درس دے رہا ہے جو تمام مصلحینِ سلف دیتے آئے ہیں یعنی بدعتوں سے بچنا اسراف و تبذیر سے پرہیز کرنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو معیارِ عمل بنانا۔

مضمون کے جن فقروں کو نشانۂ اعتراض بنایا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

"رسول اللہؐ کی پیدائش یا وصال کی تاریخ ہمارے لئے نہ اہم ہے اور نہ ضروری اگر کوئی چیز اہم ہے تو ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ہے جو حد درجہ آزمائشی اور صبر شکن تھا۔"

بے شک خط کشیدہ فقرہ کچھ احتیاط سے لکھا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا لیکن بصورتِ موجودہ بھی اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تخفیف کا کوئی پہلو ہرگز نہیں ہے۔ فقرے کو سیاق و سباق سے اکھیڑ کر کوئی معترض چاہے جو بھی معنی پہناتا پھرے لیکن اپنے سیاق و سباق میں اس کا کوئی مفہوم ایسا نہیں بنتا جو حدودِ احترام سے متجاوز اور آدابِ تکریم سے منحرف ہو۔ اس پر توہین و گستاخی اور دریدہ دہنی اور منافقت و زندیقی اور بے ادبی اور بدتمیزی کے وہ تابڑ توڑ الزامات چسپاں کرنا جو اخبارات کے تراشوں میں نظر آرہے ہیں ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کے منھ کا ذائقہ شدید بخار کی وجہ سے کڑوا ہو چکا ہو اور وہ میٹھے حلوے کا نوالہ لے کر شور مچائے کہ یہ تو کڑوا ہے۔ اس میں ایلوا اور نیم ملا دیا گیا ہے۔ اس کے پکانے والے کو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کرو۔

حد ہے کہ کچھ لوگوں نے تو عدالتی کارروائی کی بھی دھمکی دی ہے اور ایک تنظیم باقاعدہ دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہے کہ نشیمن نے ہمارے پیغمبر کی توہین کی ہے۔ خدا جانے یہ مقدمہ دائر ہوگا یا نہیں۔ اگر دائر ہو جائے تو ہم بہ بانگِ دہل اعلان کرتے ہیں کہ خود ہم اس مضمون کی ایک ایک سطر سے متفق ہیں اور اگر مدیرِ نشیمن معافی مانگ لینے کی وجہ سے بری الذمہ قرار پائیں تو تجلی حاضر ہے کہ کوئی کرم فرما اس پر دعویٰ دائر کر دیں۔ اگر ان کا وکیل یہ مشورہ دے کہ جب تک تجلی ہی کے صفحات میں یہ مضمون نہ آئے اسے مدعیٰ علیہ نہیں بنایا جا سکتا تو ہمیں مطلع کیا جائے تاکہ ہم بلا تامل اس مضمون کو تجلی میں شائع

کردیں گے اور یہ بھی وعدہ کرتے ہیں کہ پھانسی کے تختے تک معافی نہیں مانگیں گے۔ علاوہ اس کے اگر قانون نے اجازت دی تو ہم اپنی وکالت بھی خود ہی کریں گے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی کونسی عدالت اس مضمون پر فردِ جرم لگاتی ہے۔ نیز یہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے روحِ شریعت سے بغاوت کرکے ایک تیسری عید دین میں گھڑلی ہے اور دنیا بھر کی فضول خرچیاں اور لغویات اس عید میں جائز کرلی گئی ہیں وہ کس طرح خود کو اس الزام سے بچالے جاسکیں گے کہ دین وشریعت کے، رسولؐ کے، صحابہؓ وتابعین کے اور ائمہ ومجتہدین کے اسوے اور تعلیمات سے منحرف وہ خود ہیں۔ بدعت کا داغ خود ان کی پیشانی پر ہے جس دن اللہ نے رسولؐ کی زبان پر اعلان فرمایا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ اس دن تک نہ رسولؐ فداہ امی وابی کے نہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے حاشیہ خیال تک میں یہ بات آئی تھی کہ مرے ہوئے بزرگوں کی سالانہ عیدیں منانی چاہئیں۔ اگر اس میں کچھ بھی خیر ہوتی تو کھلی بات ہے کہ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کم سے کم حضرات ابراہیمؑ کا جشنِ میلاد تو ضرور ہی مناتے کہ جس ملت کو "اسلام" کا عنوان دیا گیا وہ "ملتِ ابراہیمی" ہی کے نام سے موسوم ہے۔

پھر حضورؐ جب رحلت فرما گئے تو ناممکن تھا کہ صحابہؓ سال بہ سال ان کا میلاد نہ مناتے اگر اس میں ذرا بھی خیر ہوتی۔ وہ جانتے تھے کہ جو ذوق ومزاج جشنوں اور عیدوں کا رسیا ہوجاتا ہے۔ اس کے قوائے عمل کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ محض شاعری کرتا ہے جہاد نہیں کرتا۔ زمین آسمان کے زبانی قلابے ملاتا ہے نفس کُشی اور کردار سازی سے دلچسپی نہیں رکھتا اسی لئے صحابہؓ نے نہ جشنِ میلاد منایا نہ عرس۔ نہ قوالیاں گائیں۔ نہ قبرِ رسولؐ پر مراقبہ کیا۔

ایک روزنامے کی خبر ہے:۔

"نشیمن کے ایڈیٹر مسٹر عثمان آسا نے آج شب سِل مارکیٹ میں جمعیۃ القریش کے ایک جلسے میں حاضر ہوکر ان گستاخیوں کی معافی مانگی جو اخبار نشیمن کے تھرڈ اخیر کے کالم میں آنحضرتؐ سے کی گئی تھی اور آئندہ اس قسم کے حرکات نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے عاجزانہ التماس کیا کہ انھیں اس بار معاف کردیا جائے۔

اگر آئندہ انھوں نے مسلمانوں کے عقائد بزرگوں کے خلاف یا عام مسلمانوں کے خلاف کچھ لکھا تو عوام کو اختیار ہے جو چاہے سزا دیں۔"

اگر یہ خبر صحیح ہے تو ہم کہیں گے کہ مدیر نشیمن نے اچھا کیا معافی مانگ لی۔ تاجر کو گاہکوں کی مرضیات کے آگے جھکنا ہی چاہیئے اور اس شخص کو تاجر کے سوا کیا کہیں گے جو سچ اور حق بات کو اس لئے واپس لے لے کہ لوگ ناراض ہوگئے ہیں۔ مدیر نشیمن اگر واقعی حق پرست ہوتے تو انھیں سوچنا چاہیئے تھا کہ دعوتِ حق کو تو ہمیشہ ہی اسی نوع کی ابتلار کا شکار ہونا پڑا ہے مصلحین کے ساتھ ہمیشہ ہی ایسے ناروا سلوک ہوتے آئے ہیں۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا نہیں ہوا۔ ایمان نے اگر ان کے قلب نورانی کو فولاد کے سانچے میں نہ ڈھال دیا ہوتا تو کس کے بس میں تھا جو اس قدر شدید مصائب برداشت کرجاتا جتنے ہمارے آقاؐ نے کئے ہیں۔ تصور تو کرو تین طویل سالوں تک شعب ابی طالب میں نبیِ معصومؐ آلِ ہاشم سمیت قیدیوں کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ببول کی پتیوں اور چمڑے کے سوا کھانے کو کچھ نہیں۔ ننھے ننھے بچے فقر وفاقہ سے بلک رہے ہیں۔ ہر شخص زار ونزار ہے۔ اور جرم کیا ہے؟ یہ کہ رسولؐ ایک ایسی بات کہہ رہا ہے جو اہلِ کفر کو پسند نہیں۔ اہلِ کفر کہتے ہیں:۔

"اے محمد! تجھے ہم اپنا بادشاہ مان سکتے ہیں۔ تیرے لئے بہتر سے بہتر حسینائیں مہیا کرسکتے ہیں۔ تجھے زر وجواہر سے تول سکتے ہیں۔ تو جو چاہے مانگ لے مگر یہ مت کہہ کہ خدا بس ایک ہے اور ہم سب اور ہمارے باپ دادے احمق تھے جو دیوی دیوتاؤں کو پوجتے آئے۔"

دشمنوں میں گھرا ہوا، بے یار ومددگار، غیر مسلح محمدؐ اس کے

جواب میں کیا کہنا ہے یہ بھی یاد کرلو:۔

"خدا کی قسم! اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج
اور ایک ہاتھ میں چاند بھی رکھ دو تو میں اُس چیز
سے باز نہ آؤں گا جس کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ خدا
ایک ہے۔ خدا ایک ہے۔ خدا ایک ہے"

یہ ہمالیہ جیسا بلند نمونہ ہے عزیمت اور استقامت علی الحق کا۔ ہم دنیا کے کتّے اور آقاؐ کے ناخلف غلام اس کی پیروی تو کیا کرسکتے ہیں مگر ایسا بھی کیا کہ ہوائے مخالف کا ایک جھونکا اور موجِ تند کا ایک تھپیڑا ہم سے برداشت نہ ہو اور تھوڑے سے جانی و مالی نقصان کے ڈر سے ہم گھٹنے ٹیک دیں۔

خیر۔ یہ تو مدیر نشیمن کی اپنی صوابدید تھی جیسا چاہا کیا مگر ہنسی ہمیں ان لفظوں پہ آتی ہے جنھیں زیر خط کر دیا ہے۔ آپ انھیں پھر پڑھ لیجئے۔ ان کا مطلب کچھ ایسا نکلتا ہے جیسے مدیر نشیمن کوئی غیر مسلم ہوں کہ انھیں اسلامی عقائد پہ گفتگو کا حق ہی نہ ہو۔ جیسے اسلام عوام الناس کا خادم ہو کہ یہ مسخرے جیسے چاہے غلط سلط عقائد رکھیں اور کوئی مسلمان انھیں ٹوک ہی نہ سکے۔ واہ رے دوستو! یہ اسلام آپ کی جاگیر بھلا کب سے ہوگیا۔ یہ "مسلمانوں کے عقائد" کیا چیز ہوتے ہیں اگر انھیں قرآن و سنت کی تائید حاصل نہیں ہے۔

ہم نشیمن کے دیگر مضامین کی کوئی صفائی پیش نہیں کرتے لیکن جہاں تک زیربحث مضمون کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے عین مطابق اور مستند علماء سلف و خلف کی رائے کا صحیح ترجمان اور کسی بھی شخص یا گروہ کی ذاتی توہین و تنقیص سے یکسر خالی ہے۔ غل غپاڑہ مچانا یا اوندھی سیدھی روایتوں اور قصہ کہانیوں کو دلیل کا نام دینا الگ بات ہے لیکن جہاں تک علم و تحقیق کا سوال ہے ہم ان تمام بزرگوں کو جن کا یہ دعویٰ ہے کہ عید میلاد النبی اسلامی تیوہار ہے دعوت دیتے ہیں کہ وہ سنجیدہ علمی انداز میں اپنے دلائل پیش فرمائیں اور جواباً ہمارے بھی دلائل ٹھنڈے دل سے سنیں۔ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اگر بدعت پسند مولویوں اور صوفیوں کی غلط تعلیم و ترغیب سے عید میلاد النبیؐ کو دینی شعار سمجھنے لگی ہے تو یہ کوئی دلیل نہیں ہے اس کے دینی شعار ہونے کی۔ یہ صریح بدعت ہے جسے فضول خرچی اور نمائشِ بے جا سے آلودہ کرکے اور زیادہ خلافِ شرع بنا لیا گیا ہے۔ شریعت کسی کی باندی نہیں کہ اس سے جو چاہے معاملہ کرو اور جس طرح چاہے اس سے خدمت لو۔

آئیے اس خاص فقرے کا بھی تجزیہ کریں جو سب سے زیادہ ہدفِ اعتراض بنایا گیا ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ خلاقِ اکبر کا شاہکارِ قدرت ہے۔ یہاں خود رَو گھاس کی ایک پتّی بھی اور سمندر کی ریت کا ایک ذرہ بھی قدر و قیمت سے خالی نہیں لہٰذا اس کی اہمیت سے انکار ناممکن۔ یہاں نور کے مقابلے میں ظلمت اور نیکی کے مقابلے میں برائی بھی حکمت سے خالی نہیں۔ نمرود و فرعون اور ہامان و شدّاد اور ابوجہل و ابولہب اور چنگیز و ہٹلر بھی عبث پیدا نہیں کئے گئے یہ نہ پیدا کئے گئے ہوتے تو انبیاء و صلحاء کے اسوۂ و کردار کا حسن کیسے نکھرتا۔ تاریکی کا وجود نہ ہو تو روشنی کی قدر و قیمت کس کی سمجھ میں آئے۔

جب یہ بات ہے تو کوئی بھی ہوش مند کارخانۂ قدرت کی کسی بھی شے اور ہستی اور ذات کی اہمیت کا بالکلیہ اور ہمہ جہتی انکار تو کرہی نہیں سکتا۔ سردارِ دوجہاں سیّد الابرار محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑی چیز ہیں' ان سے کم درجے کے انبیاء بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور کس کی مجال ہے کہ ان کی قدر و قیمت گھٹا سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پوری مخلوق میں سب سے برتر ہیں۔ انھیں اللہ نے سارے عالم کے لئے رسول بنایا۔ ان کے ذریعے دنیائے انسانیت کو خدا کا وہ کلام ملا جس کی تحریف ممکن نہیں۔ جسے مٹانا تو درکنار بدلا بھی نہیں جاسکتا۔ پھر اپنے کلامِ منطوق کے علاوہ اللہ نے آپؐ پر

ایسی وحی بھی نازل کی جو ذریعہ تلاوت اگرچہ نہیں آتی لیکن اس کی روشنی میں آپ نے قرآنی اجمال کی تفصیل اور احکامِ ربانی کی تشریح پیش کی جس کے نتیجے میں اسلام ایک مکمل قابلِ عمل نظامِ حیات کی شکل اختیار کر گیا اور انسانوں کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت اسلام کا ذریعہ حضورؐ ہی بنے۔ ہزار ہزار سلام آپؐ پر اور آپؐ کے سچے پیروؤں پر۔

نشیمن کے معترض فیہ جملے میں جس چیز کی اہمیت و ضرورت کا انکار کیا گیا ہے اس کا ذرا بھی تعلق حضورؐ کی اس عظیم حیثیت اور رفیع شان سے ہرگز نہیں۔ اس میں جس چیز سے انکار کیا گیا ہے وہ ہے پیدائش و وفات کی تاریخ اور انکار بھی ایک صحیح تر مقصد کے لئے کیا گیا ہے یعنی آپؐ کی اطاعت اور پیروی کی دعوت دینے کے لئے۔

یہاں کوئی صاحب ہمیں یہ اطلاع نہ دیں کہ مدیرِ نشیمن ایسے ہیں اور ویسے ہیں۔ وہ اپنے کردار اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے کیسے ہی ہوں یہ ان کا اور ان کے خدا کا معاملہ ہے۔ ہمیں صرف اسی مضمون سے بحث ہے جو نشانۂ ملامت بنا ہوا ہے۔ مضمون میں بے ریب و شک قرآن و سنت کی صحیح ترین تعلیم پر توجہ دلائی گئی ہے اور جس نوع کی تعظیم و تکریم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ کو پسند ہے وہ بھی اس میں موجود ہے۔ توہین، گستاخی اور بدتمیزی تو اس مضمون میں صرف وہی لوگ پڑھ سکتے ہیں جنھوں نے اپنے ذہنوں میں حضورؐ کی ایک غلط تصویر بٹھا رکھی ہے۔ جو غلو کا شکار ہیں۔ جنھوں نے قرآن کی آیاتِ محکمات اور صحیح ترین احادیث کو نظر انداز کر کے کمزور اور ناقابلِ اعتبار روایات اور تخیل کے زور سے عجیب و غریب عقائد گھڑ لئے ہیں اور نہایت بیباکی کے ساتھ ان عقائد کو عقائدِ اسلامیہ کا نام دیئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اسلام وہ ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہو وہ نہیں جو ہم لوگ دل سے گھڑ لیں۔ انبیاء و رسل مبعوث ہی اس لئے کئے جاتے ہیں کہ جو تعلیمات وہ اللہ کی ہدایات کے مطابق پیش کریں ان پر عمل کیا جائے۔ ان پر ایمان لانے اور ان سے محبت کرنے کا مطلب بھی قرآن و حدیث ہی میں یہ بیان ہوا ہے کہ ان کی عملی پیروی کی جائے۔ وہ لوگ اللہ کے یہاں سخت ناپسندیدہ ہیں جو کسی پیغمبر کی زبانی مدح و ثنا میں تو زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں مگر اسکی لائی ہوئی شریعت پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ اگر انبیاء کی حد سے بڑھ کر تعریف ہی اللہ کو پسند ہوتی تو سب سے زیادہ محبوب نصاریٰ ہی ہوتے جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا ہی بنا ڈالا۔ مگر دیکھ لو اللہ ان سے کتنا ناراض ہے۔ کس قدر شدومد سے ان پر نکیر کرتا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ماں کے پیٹ سے نہیں ملی بلکہ چالیس سال بعد ملی۔ جو لوگ کمزور روایات کے بل پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ نے حضورؐ ہی کا نور پیدا کیا اور تخلیقِ آدم سے پہلے ہی ان کے لئے نبوت تجویز کر دی وہ یہ بھول رہے ہیں کہ عالمِ بالا کے اس واقعے سے دنیاوی حقائق میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ زید آج کسی کو قتل کرتا ہے تو اللہ کو ازل کے دن سے معلوم ہے کہ فلاں دن فلاں وقت فلاں جگہ فلاں طریقے سے یہ قتل واقع ہوگا لیکن کیا عالمِ ظاہری کے اعتبار سے بھی آپ کہہ سکیں گے کہ زید ماں کے پیٹ ہی سے قاتل پیدا ہوا اور گذشتہ کل بھی وہ قاتل ہی تھا حالانکہ فعلِ قتل اس سے آج واقع ہو رہا ہے۔

بے شک اللہ کے علم میں پہلے ہی سے وہ سب کچھ ہے جو واقع ہونے والا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ فلاں فلاں بندے نبوت سے سرفراز ہونے ہیں اور فلاں فلاں سرکشی اور کفر پر زندگی گذارنے والے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں فرشتوں کو سجدے کا حکم دوں گا تو ابلیس انکار کرے گا اور راندۂ درگاہ ہوگا لیکن قرآن دیکھ لیجئے۔ وہاں آپ کو یہی ملے گا کہ ابلیس جب سجدے سے انکار کر چکا اس وقت اللہ نے اسے کافر اور راندۂ درگاہ قرار دیا۔ گویا تخلیق کے ساتھ

کسی بھی صفت کا اتصاف اس وقت مانا جاتا ہے جب وہ عالمِ ظاہری میں واقع ہو جائے تو کسی بھی نبی کا نبی اور ولی کا ولی ہونا اگرچہ علمِ الٰہی میں پہلے ہی سے ہے لیکن ہم دنیا والے اسے نبوت یا ولایت سے موصوف اسی وقت کر سکیں گے جب واقعہ دنیا میں ظہور پذیر ہو جائے گا۔

تو ظاہر ہے کہ حضورؐ جب پیدا ہوئے اس وقت نبی اور رسول نہیں تھے۔ یہ منصب جلیلہ آپ کو چالیس سال بعد عطا کیا گیا ہے۔ پیدائش کے وقت آپ صرف محمد بن عبداللہ تھے۔ آمنہ کے لال۔ ایک ایسے بچے جس کی پیدائش سوائے چند خون کے رشتہ داروں کے دنیا میں کسی کے لئے بھی دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا معنی ہیں آپ کے یوم پیدائش کو یوم عید بنانے کے۔

اور چلیئے حقائق و دقائق سے قطع نظر کر کے یہ بھی مان لیجئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ایک رسولؐ ہی کی پیدائش تھی مگر یہ پیدائش تو دنیا کو کچھ نہیں دیتی۔ دیا جو کچھ ہے وہ آپ کی رسالت نے دیا ہے۔ اسوۂ حسنہ نے دیا ہے۔ تعلیماتِ وحی نے دیا ہے۔ لہٰذا اہمیت سب سے زیادہ یوم رسالت کی ہے نہ کہ یوم پیدائش کی۔ پھر یوم رسالت کی اہمیت بھی ہمارے من مانے قیاسات کا کھلونا نہیں بن سکتی کیونکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم سے بڑھ کر ہم دین کے عالم و عامل نہیں۔ ان لوگوں نے "یوم رسالت" نہیں منایا لہٰذا ان کا یہ اسوہ ہمارے لئے حجت اور مشعلِ راہ بنا۔ ہم اگر ان کی پیروی نہیں کرتے تو گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انھیں دین کا علم کم تھا اور عمل کی توفیق بھی کم۔ ہمیں دین کا علم زیادہ ہے اور عمل کی توفیق بھی ان سے بڑھ کر۔

سچ یہ ہے کہ رسولؐ اور صحابہؓ کی توہین کرنے والے تو وہ لوگ ہیں جو ایسے اجتہادات کے مرتکب ہوتے ہیں جنھیں رسولؐ اور صحابہؓ کا اسوہ رد کر چکا ہے۔ بدعت نکالنا اصل دین کو ناقص اور ناتمام قرار دینا ہے۔ خدا کی شان ہے کہ اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ مبتدع اہلِ سنت پر طعنہ زنی کریں۔ مجرم بے جرموں کو نشانہ بنائیں۔

نشیمن کے مضمون کا سیاق و سباق صاف بتا رہا ہے کہ معترض فیہ جملہ قطعاً بے غبار ہے اور غبار جو کچھ ہے وہ معترضین کے دل و دماغ میں ہے۔ پیدائش کی تاریخ میں ایسی کسی اہمیت کے تصور تک سے قرآن و حدیث خالی ہیں جس پر معترضین زور دے رہے ہیں اور تاریخ وصال کی اہمیت کا تو سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ حجۃ الوداع میں خالقِ کائنات نے اعلان فرما دیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم۔ آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ گویا دوسرے لفظوں میں یہ اعلان ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جس مقصد سے رسول بنایا گیا تھا وہ پورا ہوا اب دنیا میں انھیں باقی رکھنا مشیتِ ایزدی کے خلاف ہے۔ اب ان کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اب انھیں اللہ اپنی طرف بلا رہا ہے۔

کلّ من علیہا فان۔ جو بھی آیا ہے اسے تو جانا ہی ہے۔ حضورؐ فداہ امی و ابی ایک بندے ہی تو تھے۔ بندے سے اللہ اپنا کام لے چکا تو پیکِ قضا کو بھیج دیا۔ جو انبیاء سیکڑوں سال زندہ رہے وہ بھی آخر کار موت سے ہمکنار ہوئے لہٰذا موت اور وصال اور وفات و رحلت کوئی ایسا واقعہ نہیں جسے مستقل بالذات اہمیت دی جائے۔ رنج اور صدمہ بے شک ہوتا ہے۔ حضورؐ نے وفات پائی تو صحابہؓ کو بھی بیحد رنج ہوا لیکن انھوں نے نہ تیجہ منایا نہ چہلم۔ نہ برسی۔ وہ جانتے تھے کہ ان لغویات کے لئے اللہ اور رسولؐ کی تعلیمات میں کوئی گنجائش نہیں۔ بس یہی چیز ہے جسے معترض فیہ جملے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے توہین و تخفیف کا کیا تعلق۔

یہ دراصل حضورؐ کی ذاتِ والا صفات کیساتھ تمسخر ہے کہ ان کی مدح و ثنا اور توصیف و منقبت کے لئے وہ طریقے اختیار کئے جائیں جنھیں وہ ناپسند کرتے تھے۔ ان کی روح شریفہ پر کیا گذرتی ہوگی اگر اللہ کے حکم سے انھیں ایسا کوئی منظر دکھا دیا جاتا ہوگا جیسا آج کل کے جشنوں میں عام ہے۔ بے انتہا اسراف۔ عورتوں کی چہل پہل۔ نمازوں کا ضیاع اور رسولؐ کی تعریف ! اخلاقِ حسنہ سے دوری اور سراپا اخلاق

رسولؐ کی منقبت۔

وہ کہہ کر گئے تھے مجھے بڑھاؤ چڑھاؤ مت۔ غلو سے پرہیز کرو۔ نمود و نمائش اور عبث مشاغل سے دور بھاگو۔ مگر ہم سب سے زیادہ شوق بڑھانے اور چڑھانے ہی کا رکھتے ہیں۔ ایک ناقابلِ التفات روایت مل گئی کہ رسولؐ کا سایہ نہیں تھا۔ بس ہم جم گئے کہ یہ تو سو فی صدی درست ہے۔ اب چاہے قرآن و حدیث کے ہزار دلائل اس کے خلاف موجود ہوں کوئی لائقِ اعتنا نہیں۔ کسی خفتہ دماغ نے دَنٰی فَتَدَلّٰی اور قَابَ قَوسَین کی یہ غلط تفسیر کردی کہ حضورؐ اللہ سے اتنے قریب ہوگئے کہ دو کمانوں سے بھی کم فاصلہ رہ گیا اور ہم عقل و نقل اور قواعدِ زبان اور آیاتِ محکمات کو پسِ پشت ڈال کر اسی تفسیر کے ہو رہے جیسے دیکھو آنکھیں بند کر کے یہی گائے جا رہا ہے۔

رسول اللہؐ عالم الغیب ہیں حاضر و ناظر ہیں۔ دوزخ جنت کے مالک ہیں۔ جو چاہے کرسکتے ہیں۔ اس طرح کے غلط سلط عقائد بڑے شوق سے گھڑ لئے گئے اور رکیک قسم کے علم کلام کا سہارا لے کر صحیح احادیث اور محکم آیات کا منھ چڑایا گیا۔ اب نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ کوئی مسلمان ان خلافِ شرع عقائد کی تردید کرے تو اسے مقدموں کی دھمکیاں اور آتش زنی کی دھونس دی جاتی ہے اور حکومت کو پکارا جاتا ہے کہ اس کی زبان کھینچو۔ گویا اسلام اور قرآن و حدیث ان خوش فکروں کی جاگیر بن گئے۔ یہ جس من گھڑت عقیدے کو اسلام سے منسوب کردیں وہ واقعی اسلام کا عقیدہ بن جائے۔ ڈھٹائی کی یہ وہ آخری حد ہے جس سے زیادہ کا تصوّر مشکل ہے۔ نورٌ علیٰ نور یہ کہ ان ہی غلط سلط عقائد کیلئے "علمائے اسلام" کو بھی اپنا ہمنوا قرار دے لیا جاتا ہے۔ گویا قرونِ شر کے جن سو دو سو لوگوں نے دستارِ فضیلت باندھ کر اپنے عالم ہونے کا اعلان کردیا وہ تو "علمائے اسلام" ٹھیرے اور یہ جو ابتدائی پانچ سو برسوں تک ہزاروں علماء و اتقیاء اور محدثین و مفسرین گذرے ہیں وہ سب "علمائے اسلام" نہیں تھے۔ سچ فرمایا باری تعالیٰ نے

وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ انعام۔ (اور بہت لوگ بغیرِ علم ہی کے بس اپنی خواہشاتِ نفس کے تحت گمراہی پھیلاتے پھرتے ہیں)

بہرحال نشیمن کے زیرِ تذکرہ مضمون پر جتنی گالیاں مدیرِ نشیمن کو دی گئی ہیں ہم نے خود کو بھی ان میں اس لئے شریک کرلیا ہے کہ کلمۂ خیر کی تائید میں گالیاں کھانا بھی ہمارے نزدیک سعادت ہے اور اس سعادت کی پاداش میں اگر نشیمن کی طرح تجلی کا بھی کسی حلقے میں بائیکاٹ کیا جائے اور اس کی کاپیاں سرِ بازار جلائی جائیں تو یہ ہمارے لئے مژدہ ہوگا نہ کہ سانحہ۔ غضب ہے کہ مدیرِ نشیمن ایک سرتاسر برحق موقف سے ہٹ گئے اور تازہ نشیمن میں دیکھا کہ "تھپڑ اخیں" بھی غائب ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حالانکہ وہ اگر استقامت دکھاتے اور کچھ نقصان بھی اس استقامت کی سزا میں اُٹھا جاتے تو عین ممکن تھا کہ ان کے لئے یہ اسوہ کفارۂ سیئات ثابت ہوتا۔ ہم تو ہر آئینہ اس کے قائل ہیں کہ نادانستہ طور پر اگر کلمۂ باطل قلم سے نکل جائے تو اطلاع پاتے ہی اس سے علانیہ رجوع کیا جائے اور عفو طلبی میں دیر نہ لگائی جائے لیکن اگر کلمہ حق ہے اور غلط طور پر اسے نشانۂ مخالفت بنایا جا رہا ہے تو پھانسی کے تختے تک اس سے نہ ہٹا جائے۔ قلِ غپاڑا۔ دھونس دھمکی۔ مالی خسارہ اور جسمانی خراشیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ حضرت بلالؓ کو چلچلاتی دھوپ میں لٹا کر سینے پر دوزنی اور گرم پتھر رکھا جاتا تھا اور اس پر مزید بوجھ ڈال کر کہا جاتا تھا کہ باز آجاؤ نئے دین سے۔ مگر یہ اللہ کا بندہ ایک ہی صدا لگائے جاتا تھا:۔

" اللہ ایک ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اللہ ایک ہے"۔

اور ایک بلالؓ ہی کیا ۔۔۔ تاریخ دعوت و عزیمت تو ایسی ہزاروں مثالیں اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ پھر کیا حرج تھا اگر مدیرِ نشیمن تھوڑی سی چوٹ کھا ہی جاتے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ عید میلاد النبی میں خیر و برکت اور فوائد کے پہلو متعدد ہیں۔ واعظین و مقررین عوام الناس کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور خصائل مبارکہ کے بارے میں بے شمار ایسی معلومات بہم پہنچاتے ہیں جن سے وہ بے بہرہ ہیں اور قلب و ذہن میں عقیدتِ رسولؐ کی بادِ بہاری چلنے لگتی ہے جس کا ہر جھونکا مشامِ روح کو معطر کرتا ہے۔ اللہ کے بعد حضورؐ سے بڑھ کر کس کا ذکر متبرک ہوگا۔ ان پر لاکھوں درود اور سلام۔ ان کی یاد تو روحِ ایمان اور جانِ اسلام ہے۔ ان پر ہمارا سب کچھ قربان۔ انکی خوشنودی اللہ کی خوشنودی اور ان کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی ہے۔ لیکن کوئی ہوشمند اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ کو سب سے زیادہ شریعت پیاری تھی۔ وہ دین پیارا تھا جس کی خاطر آپ نے ساری عمرِ رسالت سختیوں اور آویزشوں اور آزمائشوں میں کھپائی۔ آپ نے تو اپنی بیٹی فاطمہؓ تک کے بارے میں صاف کہہ دیا کہ وہ اگر چوری کرے گی تو اس کا بھی ہاتھ کٹے گا۔ گویا حقیقی اولاد بھی احکامِ شریعت پر قربان۔ کسی کے ساتھ شریعت کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں۔

پھر کیسے وہ اور ان کا خدا ایسی کسی تقریب سے خوش ہو سکتے ہیں جس میں فسق یا بدعت یا سوءِ عمل کی آمیزش کر دی گئی ہو۔ گھڑے بھر قیمتی مشروب میں چند قطرے ناپاکی کے ملا دیجئے سب کا سب برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح حضورؐ کی یاد اور نعت اور تعظیم کے کارِ خیر میں گناہ کا شمول کر دیجئے ساری افادیت ختم ہو جائے گی۔

حضورؐ کا ذکرِ مبارک ایک دن نہیں سو دن بر حق۔ سو دن کیا۔ زندگی کا ہر دن اس سے معمور ہو تو زہے نصیب لیکن طریقہ ایسا ہونا چاہیئے جو اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کا باعث ہو —— دیکھ لیجئے کہ اللہ نے مسلمانوں کیلئے دو عیدیں مقرر کیں اور دونوں کا وصفِ خاص عبادت قرار دیا۔ نہ چراغاں۔ نہ ہاؤ ہو۔ کچھ بھی نہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہنو۔ تکبیر و تہلیل کے ساتھ عیدگاہ جاؤ آؤ۔ غریبوں کو پیسہ، اناج یا کپڑا دو۔ اللہ کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرو۔

بس۔ سال بھر میں سیرۃ النبیؐ کے دو سو جلسے بھی ہوں تو زیادہ نہیں لیکن ان میں فضول خرچیاں اور غپ بازیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ نہ یہ ہونا چاہیئے کہ آدھی رات تک وعظ سنو اور دن چڑھے تک سوتے رہو نمازِ فجر غائب۔ نہ یہ ہونا چاہیئے کہ مَردوں کے مجمعوں میں برقعوں کی کھیتی لہرائے اور شیطان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ نہ کسی واعظ اور مقرر کو ضعیف اور واہی روایتوں کے ذریعہ غلط عقائد عوام کے دماغوں میں اتارنے چاہئیں۔ نہ حضورؐ کی تعریف میں افراط و تفریط سے واسطہ رکھنا چاہیئے۔ اصل مقصد ہو حضورؐ کے اسوے اور آپ کے لائے ہوئے دین پر چلنا چلانا، منکرات و معاصی کی جڑیں کاٹنا اور معروفات و محاسن کی آبیاری کرنا۔ توحید پر جمنا اور شرک و بدعت کا قلع قمع کرنا۔ جو لوگ کام کا وقت باتوں میں گنواتے ہیں اور زبانی جمع خرچ کو عملی جدوجہد پر ترجیح دیتے ہیں وہ اسلام کے دوست نہیں دشمن ہیں۔ معجزات و عجائبات کا کثرت سے ذکر کرنا اور احکامِ شرعی کو ثانوی درجے میں رکھنا اوندھی منطق ہے جو عرش کی طرف نہیں تحت الثریٰ کی طرف لے جاتی ہے۔ معجزات تو پیغمبروں کو اہلِ کفر پر حجت قائم کرنے کے لئے دیئے گئے تھے۔ ہم جب توفیقِ الٰہی سے ایمان لے آئے تو معجزوں پر سر دھننے کے بجائے ہمیں شریعت کی تعمیل اور اسلام کی ترقی سے دلچسپی ہونی چاہیئے۔ ہمیں اس سے دلچسپی ہونی چاہیئے کہ معاشرے کے غیر اسلامی رنگ کو اسلامی رنگ و بو میں کیسے تبدیل کیا جائے۔ باطل عقائد و افکار اور تباہ کن رسم و رواج کو کیسے مٹایا جائے۔ برادرانِ اسلام کی پستی اور جہالت کو بلندی اور شعور میں کیسے بدلا جائے۔ ذلت اور بے بسی کی زندگی کو عزت اور شوکت کے سانچوں میں کیسے ڈھالا جائے۔ اسلام دشمن قوتوں کے مقابلے میں وہ ساز و سامان کیوں کر مہیا کیا جائے جس کی تلقین قرآن میں آئی ہے۔ غرض جشنِ سیرت سر آنکھوں پر مگر طریقہ، ہیئت، مقصد اور مدعا تعلیماتِ رسولؐ ہی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ میلہ ٹھیلہ۔ ہاؤ ہو۔ چھٹی منانا۔ چراغاں کرنا۔ سب غیر ضروری باتیں ہیں۔ ان سے نقطۂ نظر پارہ

کو غذا ملتی ہے دین و ملت کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔

جن لوگوں نے عید میلاد النبی میں کئے جانے والے اسراف و تبذیر کو (کھلی فضول خرچیوں کو) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا میں بیان کی جانے والی بے شمار غیر مستند روایتوں کے ذکر اذکار کو مبارک اور موجب خیر و برکت اور وجہ ثواب سمجھ لیا ہے انھیں اگر ذرا بھی عاقبت کی فکر ہے تو خدارا وہ قرآن کی درج ذیل آیت پر غور کریں۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انعام میں فرماتا ہے:۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ (آیت ۱۲۱)

اور اسے نہ کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا۔ اور وہ بیشک حکم عدولی ہے۔ اور بیشک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈالتے ہیں کہ تم سے جھگڑیں اگر تم ان کا کہنا مانو تو اس وقت تم مشرک ہو۔

نوٹ فرما لیجئے کہ آیت کا ترجمہ نہ مولانا اشرف علیؒ کا ہے نہ شیخ الہندؒ کا نہ کسی اور دیوبندی بزرگ کا بلکہ یہ ہم نے بریلوی مکتبِ فکر کے امام مولانا احمد رضا خاں صاحب کے ترجمۂ قرآن سے نقل کیا ہے۔ موصوف میلاد النبیؐ اور اسی نوع کی دیگر چیزوں کے بڑے حامیوں میں سے تھے لہٰذا ان کی تفسیر قرآن تو بہر حال کسی "وہابی" کی تفسیر نہیں ہے کہ بریلوی حضرات کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ اس ترجمے پر انھوں نے تفسیری حاشیہ کیا دیا ہے یہ بھی ابھی ہم عرض کرتے ہیں۔

اکثر مسلمان بھائی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مشرک صرف وہ لوگ ہیں جو کسی دیوی دیوتا کو کھلم کھلا خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔ یا بت پوجتے ہیں۔ مسلمان مشرک ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ دیوی دیوتاؤں کا قائل نہیں نہ بتوں کا پجاری ہے۔

مگر یہ آیت بتا رہی ہے کہ شرک صرف اسی کا نام نہیں بلکہ یہ بھی شرک ہے کہ حلال و حرام کے معاملہ میں آدمی مستند شرعی مآخذ و مصادر کو نظر انداز کر کے اپنے قیاس و رائے یا اپنے بزرگوں اور عالموں کے ذاتی خیالات کی پیروی کرنے لگے۔ اس آیت میں دیکھ لیجئے کہ خدا کے ساتھ کسی دیوی دیوتا کی شرکت کا کوئی ذکر نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جن ذبیحوں پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ان کے کھانے کو اللہ تعالیٰ گناہ قرار دے رہا ہے اور فرما رہا ہے کہ جو لوگ اس حکم خداوندی کے قائل نہیں ان کے کہنے پر چل کر اگر تم نے اس ذبیحے کو حلال مان لیا تو تم بھی مشرک ہو گئے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بعض یہودی علماء سیدھے سادھے عربوں کو یہ پٹی پڑھاتے تھے کہ جاؤ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہو کہ جناب یہ کیا ماجرا ہے کہ جس جانور کو اللہ مارے وہ تو آپ کے نزدیک حرام اور جسے ہم ماریں وہ حلال۔ (گویا مردار کی حرمت پر اعتراض مقصود تھا) نیز اسی قسم کے اور سوالات گھڑ گھڑ کر عوام کے دلوں میں شبہات اور وسواس ڈالتے تھے۔ اللہ کہہ رہا ہے کہ اگر ان شیطانوں کے کہنے میں تم آ گئے تو سمجھ لو کہ مشرک ہو گئے۔

قرآن کی ایک اور آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی تفسیر میں خود آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد منقول ہے کہ رب بنا لینے کا مطلب یہاں یہ ہے کہ ان لوگوں نے بجائے وحیِ الٰہی کے حلال و حرام کا مدار اپنے عالموں اور بزرگوں کے فیصلوں پر رکھ رکھا تھا۔ یہی شرک ہے۔

گویا توحید کی تعریف یہ ہوئی کہ تمام امور و مسائل میں وحیِ الٰہی پر اپنے اعتقادات کی بنیاد رکھی جائے اور شرک یہ ہوا کہ وحیِ الٰہی کی پروا کئے بغیر کسی اور کے کہنے سے حلال و حرام کے اعتقادات قائم کئے جائیں۔

اب مولانا احمد رضا خاں صاحب کا تفسیری نوٹ بھی

پڑھ لیجئے:-

"کیونکہ دین میں حکم الٰہی کو چھوڑنا اور دوسرے کے حکم
ماننا اللہ کے سوا اور کو حاکم قرار دینا شرک ہے۔"
(صفحہ ۱۷۱۔ انعام۔ تفسیر آیت ۱۲۱)

یعنی مولانا کے نزدیک بھی شرک فقط یہ نہیں کہ دیوی دیوتاؤں کو پوجا جائے یا علانیہ کسی کو اللہ کا شریک قرار دیا جائے بلکہ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر کسی اور کے حکم پر چلنا بھی شرک ہی ہے۔

اب دیکھئے قرآن کتنے صریح الفاظ میں فرماتا ہے:-

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ	اور رشتہ داروں کو ان کا حق دے
وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ	اور مسکین اور مسافر کو اور فضول
وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝	نہ اڑا۔ بیشک اڑانے والے
إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا	شیطانوں کے بھائی ہیں اور
إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ	شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا
الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا۔	ہے۔

(بنی اسرائیل۔ آیت ۲۷) (ترجمہ مولانا احمد رضا خاں صاحب)

عید میلاد النبی یقینی طور پر ایک بدعت ہے جو قرونِ اولیٰ کے سیکڑوں برس بعد نکال لی گئی ہے۔ اس کے قائل اور عامل زمین کی آخری تہہ تک کھود ڈالیں تب بھی کوئی نظیر ایسی نہیں لا سکتے کہ اللہ کے رسولؐ نے یا صحابۂ کرامؓ نے یا تابعینِ عظامؒ نے یا مجتہدینِ علام نے یا محدثین و مفسرین نے یہ عید منائی ہو۔ پھر بدعت کا عین گمراہی ہونا متعدد احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہے لہٰذا اس کے سلسلے میں جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ گناہ کے کام میں صرف کرنا ہوا۔ بظاہر اس بات سے بدعت پسند حضرات بہت بھڑکتے ہیں کہ لو یہ وہابی میلاد النبی کے جشن کو گناہ کہتے ہیں۔ لیکن عقلِ سلیم سے مخفی نہیں کہ صورۃً کسی چیز کا محمود ہونا حقیقتاً اس کے محمود ہونے کی دلیل نہیں۔ ایک شخص صبح کے چار اور مغرب کے چھ فرض پڑھے تو صورۃً اس نے کارِ خیر ہی میں اضافہ کیا مگر معلوم ہے کہ وہ مرتکب حرام ہوا۔ اسی طرح بدعات چونکہ دین میں اضافہ ہیں اس لئے صورۃً محمود ہوتے ہوئے بھی معناً اور حقیقتاً وہ نامحمود ہی ہوتی ہیں۔

پھر چلئے جشنِ میلاد کو ایک کارِ مباح ہی مان لیجئے۔ لیکن اس کے لئے بے تحاشا روشنیاں کرنا فضول خرچی کے سوا کیا ہے۔ محض غیر قوموں کی اندھی تقلید۔ میلے ٹھیلے کی ذہنیت۔ دنیاوی طمطراق کی شیدائیت۔ نفس کا تلذذ۔ ذوقِ نشاط کی تسکین و تفریح۔ یہ بھی عین وہی فضول خرچی ہے جس کے مرتکبین کو اللہ شیطان کا بھائی قرار دے رہا ہے۔

لہٰذا جو لوگ اس فعل کو بجائے حرام سمجھنے کے نہ صرف جائز بلکہ موجبِ ثواب اور باعثِ خیر و برکت سمجھے ہوئے ہیں کیا وہ عین مولانا احمد رضا خاں صاحب کی تفسیر کے مطابق ارتکابِ شرک نہیں کر رہے ہیں۔ کیا انھوں نے وحیِ الٰہی کو نظر انداز کر کے بعض مولویوں اور صوفیوں کے طبع زاد خیالات قیاسات کو حجت اور سند نہیں مان لیا ہے۔ کیا وہ بے شمار پیسہ اور وقت ایسے مشاغل میں ضائع نہیں کر رہے جن کے لئے قرآن اور حدیث میں کوئی سند نہیں۔

سوچو کہ آج کی رنگ رلیاں اور ہنگامہ طرازیاں کہیں حشر کے دن پچھتاوے کا باعث نہ بن جائیں۔ کہیں خدائے ذی الجلال یہ ہولناک فیصلہ نہ فرما دے کہ ان لوگوں نے ہمارے احکام کو پسِ پشت ڈال کر اپنے احبار و رہبان کو صاحبِ حکم اور مطاع مان لیا تھا لہٰذا انھیں مشرکوں کے زمرے میں رکھو۔ خدا کی پناہ۔

لکھنؤ کے "جشنِ میلاد" پر جو کچھ مولانا علی میاں ندوی کی نگرانی میں نکلنے والے جریدے "تعمیرِ حیات" نے لکھا ہے اس کا بھی بڑا حصہ پڑھ لیجئے:-

"میلادِ رسولؐ کی خوشیاں منانے اور چراغاں کرنے والی قوم اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیتی ہے کہ ان کا یہ اظہارِ مسرت ذاتِ اقدس کے لئے رنج و تکلیف کا باعث ہے، جاہلی رسوم، نمود و نمائش، اسراف بے جا، بے پردگی اور بے حیائی، فرائض سے غفلت، کونسا وہ شر ہے جو اس خیر کے پردے میں نہیں ہوتا۔ کونسی وہ

بغاوت ہے جو وفا اور محبت کے نام سے نہیں کی جاتی ــــ اسلامی شان وشوکت اور محبّت رسولؐ کا یہ عجیب غریب مظاہرہ تھا کہ جس میں اسلام اور مظلوم اور اسوۂ نبیؐ اجنبی بن کر رہ گئے ــ"

"جواز اور عدم جواز سے قطع نظر اس جشن کو ہم ملی غیرت کے لئے ایک چیلنج اور ایک زخم ملّت پر نمک پاشی سمجھتے ہیں ــــ جشن وہ قوم منا رہی ہے جس کو جشن منانے کا کوئی استحقاق نہیں۔ جو زندگی کے ہر میدان میں اپنی آبرو لٹا چکی ہے ــــ جو بے شمار مسائل سے دوچار ہے ــــ جس کا پرسنل لا خطرے میں ہے ــــ جس کی یونیورسٹی پر تالے پڑ گئے ہیں ــــ جس کے ہزاروں بچے یتیم اور نوجوان بے روزگار ــــ جس قوم کی غربت و افلاس کا یہ عالم ہے کہ اس کے لاکھوں خاندان دانے دانے کو محتاج ہیں، جن کے چولھے دو دو وقت آگ سے محروم رہتے ہیں ــــ جس قوم کی ہزاروں بیٹیاں غربت کے ہاتھوں شادی کی حسرت میں بوڑھاپے اور موت سے ہمکنار ہو رہی ہیں یا عصمت فروشی پر مجبور ــــ

وہ قوم جس کے ہزاروں کلمہ گو بھائی فلسطین، اریٹریا، حبش، اسرائیل اور مختلف مقامات پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔

وہ قوم جس کے ہاتھوں سے قبلۂ اولیٰ جاتا رہا اس قوم کے یہاں یہ جشن چراغاں ہو رہا ہے جس کے جوانوں، بچوں اور ضعیفوں کا لہو پانی سے بھی ارزاں بہہ رہا ہے۔

جس قوم کے تعلیمی اداروں، فلاحی تنظیموں کو سرمایہ کی قلت نے موت و زلیست کی کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے وہ قوم تنہا ایک شہر میں چراغاں پر بارہ لاکھ روپے صرف کر رہی ہے ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

خلافِ عقل وشرع یہ تمام رسوم اس نبیؐ کی یاد میں کی جا رہی ہیں جس پر سلام پڑھتے وقت یہ کہا جاتا ہے کہ ؎

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اس پر کہ جو بھوکا رہ کے اوروں کو کھلاتا تھا
سلام اس پر ....

حالات کا تازیانہ اور بے رحم زمانہ اگر ہمیں بیدار کرنے میں ناکام ہے تو یہ بھی ایک خوش فہمی اور خود فریبی ہو گی کہ چند اصلاحی تقریریں اور مضامین کچھ جنبش اور اضطراب پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں ملّت کا جمود تو صورِ اسرافیل کا منتظر ہے اسے خوش بیان واعظ اور صاحبِ طرز اہلِ قلم قیامت تک بیدار نہیں کر سکتے۔

اصلاحِ حال کی جدوجہد کامیاب ہو سکتی ہے۔ جو محسنِ انسانیتؐ اور آپ کے صحابہؓ نے اختیار کی وہ یہ کہ گھر گھر، کوچہ کوچہ، گلی گلی، مسجد و بازار، مدرسہ و کالج غرض ہر مقام پر پہنچکر وسیع پیمانے پر براہِ راست عوامی رابطے کی مہم شروع کر کے ان خرابیوں کو دور کیا جائے جس نے ہماری جڑوں کو کھوکھلا اور جسدِ ملّت کو داغ داغ کر دیا ہے۔

جاہلیت اور شر ایک تحریک کی شکل میں پورے عالم میں پھیل رہے ہیں "خیر" کب تک مسجد کے گوشۂ خطابت کے اسٹیج اور قرطاس و قلم تک محدود رہے گا ــــ"

وہ جس کا آپ کو انتظار تھا

قیمت تین روپے

لیکن سالانہ خریداروں کو ان کے چندے ہی میں دیا جائے گا۔
رجسٹرڈ منگانا ہو تو ڈیڑھ روپیہ جلد سے جلد بھیجدیں۔

منیجر تجلی

تجلی کے چند مخصوص نمبر آپ آج بھی حاصل کرسکتے ہیں

ڈاک نمبر | بہت سے اہم سوالوں کے مفصل اور ایمان افروز جوابات۔ اس نمبر میں صرف پانچ مضامین ہیں۔ "آغازِ سخن" (عامر عثمانی) "جماعت اسلامی کی دعوت" (مولانا مودودی) "تجلی کی ڈاک" (عامر عثمانی) "ایک کہانی ایک حقیقت" (عامر عثمانی) "مسجد سے میخانے تک" (مُلّا ابن العرب مکی) قیمت ــــ سوا روپیہ 1/25۔

خاص نمبر ۱۹۶۳ء | نوع بہ نوع مضامین۔ وقیع بحثیں دلکش مواد۔ قیمت ــ ڈیڑھ روپیہ 1/50۔

تنقید نمبر | وحید الدین خاں صاحب نے کبھی ایک کتاب لکھی تھی "تعبیر کی غلطی" اس میں انھوں نے ثابت کیا تھا کہ مولانا مودودی نے دین کی تعبیر غلط کی ہے۔ مدیر تجلی نے اس پر اپنے مخصوص انداز میں بھرپور تنقید کی ہے۔ اس کے علاوہ مشاہیر کے فرمودات کا جائزہ بھی اس نمبر میں پائیں گے۔ ڈیڑھ روپیہ 1/25!

حاصلِ مطالعہ نمبر | گوناگوں موضوعات پر نہایت قیمتی مضامین۔ اس کے تین تو بہت ہی مقبول ہو چکے ہیں۔ (۱) اسلامی تزکیۂ نفس (مولانا مودودی) (۲) جماعت اسلامی کیسے قائم ہوئی (خورشید احمد) (۳) شیخ عبداللہ کے خطوط ــ صفحات ۲۴۲ قیمت ــــ ساڑھے تین روپے 3/50۔

خاص نمبر ۱۹۶۹ء | اس نمبر کا بڑا حصہ ان اعتراضات کے تحقیقی اور علمی جوابات پر مشتمل ہے جو مولانا مودودی پر کئے جاتے رہے ہیں۔ اس کی قیمتی بحثوں کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ صفحات ۲۳۸۔ چار روپے

سالنامہ ۱۹۷۱ء | چار سو سے زائد صفحات کا یہ ضخیم نمبر بہت نفیس چیز ہے۔ ورق ورق بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ــــ چھ روپے۔

قرآن مع تفسیر و ترجمہ

ترجمہ: حضرت شیخ الہندؒ ــــــ تفسیر: علامہ شبیر احمد عثمانیؒ

ایک ہی جلد میں مکمل ہونے والے جتنے بھی تفسیر والے قرآن آج تک چھپے ہیں ان میں اس قرآن کی مثال ایسی ہی ہے جیسے تاروں میں چاند۔

علامہ عثمانیؒ نے بڑی بڑی تفسیروں کا ضروری خلاصہ اور عطر اس تفسیر میں اس طرح سمویا ہے کہ آیات کا مطلب بہ آسانی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ عالمانہ ہونے کے باوجود عام فہم زبان دلکش اور انداز سلیس و شگفتہ۔

ہدیہ مجلد رنگین خوشنما چوبیس روپے ۲۴/- ایک پر محصول ڈاک تقریباً چار روپے آئے گا۔

اسلامی ڈائری ۱۹۷۳ء | مکتبہ جماعت اسلامی کی چھاپی ہوئی چھوٹے جیبی سائز کی ڈائری حسن اتفاق سے ہمارے پاس تھوڑی سی موجود ہے۔ شائقین جلد حاصل کریں۔ قیمت ــــ ڈیڑھ روپیہ 1/50۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند۔ (یو۔پی)

مہر کی بحث • بیوی کا زیور • نظریۂ ارتقاء • خونِ نفاس • عذابِ قبر
• شرائطِ امامت • قومی ترانے کا احترام • ظہورِ مہدی • مرہونہ مکان سے انتفاع

تجلی کی ڈاک

مہر کی بحث

سوال ۱:۔ از۔ عبدالاحد۔ رائے بریلی۔

"تجلی" مارچ و اپریل کے صفحہ ۶۳ پر آپ کا یہ فرمانا تو ٹھیک ہی ہے کہ:۔

"۔۔۔۔ رسم و رواج وہی معتبر ہیں جو خلافِ شرع نہ ہوں ورنہ شریعت ان کا لحاظ نہ کرے گی۔۔۔۔"

لیکن چند سطریں قبل آپ کا یہ لکھنا کہ:۔

"۔۔۔۔ اگر رواج یہ ہے کہ عورت طلاق یا بیوگی کے بعد ہی مہر کا مطالبہ کر سکتی ہے تو اعتبار اسی رواج کا ہوگا۔۔۔۔"

سمجھ میں نہیں آتا گویا آپ کے نزدیک طلاق دینے سے پہلے مہر ادا کرنا ضروری نہیں ہے جیسا رسم و رواج ہو اس پر عمل کرنا چاہیئے یا کر سکتے ہیں۔

کیا یہ کوئی پسندیدہ کام ہے کہ جو خاندان چاہے اپنے لئے یہ قانون بنا لے کہ اس میں کا ہر شخص کچھ دن کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دیدے گا پھر اسی وقت مہر ادا کر دیگا اس سے پہلے مہر ادا کرنا اس کے لئے گویا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ اسکے خاندان کے رسم و رواج کے خلاف پڑے گا جو اس کے دل کو گوارہ نہیں ہے۔

عوام کے ذہن سے آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ اگر کوئی چیز استحباب کے درجے میں ہو لیکن ہو ان کی دلچسپی کی چیز تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس کو فرض سے زیادہ اہمیت دینگے۔ یہ رسم و رواج اگر جائز ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ کتنے لوگ اس خاندان کے اپنی بیوی کا مہر ادا کر سکیں گے۔

علاوہ اس کے ایک دوسرے پہلو پر شاید آپ نے غور نہیں کیا فرض کیجئے طلاق دینے سے پہلے ہی بیوی صاحبہ اللہ کو پیاری ہو گئیں تو اب شوہر صاحب مہر کس کو ادا کریں گے؟ کیا اللہ کے نزدیک ایسے شوہر صاحب مجرم نہ ہوں گے؟ کیا یہ مہر کی رقم دوسرے کو دیکر اس سے سبک دوش ہو جائیں گے؟ کیا زید کا حق بکر کو دینے سے زید کا حق ادا ہو جائیگا۔

بیوگی کی بات بھی آپ کی عجیب ہے۔ شوہر کی وفات کے

بعد آخر بیوہ مہر کا مطالبہ کس سے کرے گی؟ کیا آپ یہاں بھی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت کا نکاح تو ہو زید کے ساتھ لیکن مہر ادا کرے اس کا بکر؟

جواب :-

معلوم نہیں ہمیں ہی لکھنا نہیں آتا یا آپ نے ہمارا جواب پوری توجہ اور جاگتے ہوئے ذہن سے نہیں پڑھا۔ آپ اسے پھر پڑھیئے اور دیکھئے کہ اس میں ہم نے نہ کسی رواج کی تحسین و تائید کی ہے نہ یہ کہا ہے کہ مہر پہلے وصول کرنا ناجائز ہے۔ نہ یہ کہا ہے کہ کسی خاندان کا فلاں رواج پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ۔ کیا ہمارے مندرجہ ذیل الفاظ سلیس اُردو میں نہیں تھے کہ آپ کی سمجھ میں نہ آسکے۔

> "اگر کوئی شخص چاہے کہ رواج سے ہٹ کر کوئی شکل اختیار کرے تو شریعت اس سے بھی منع نہیں کرتی۔ مثلاً وہ چاہے کہ اس کی بیٹی کا کُل مہر اس کا شوہر مجلسِ نکاح ہی میں ادا کر دے یا وہ چاہے کہ شوہر ایسی تحریر لکھ دے جس کی رُو سے بیوی ہر وقت مہر کا مطالبہ کر سکتی ہو تو شریعت کی طرف سے کھُلی چھٹی ہے کہ وہ منتخب شوہر کو اس پر راضی کرے۔ طرفین راضی ہو جائیں تو شریعت بھی دخل انداز نہیں ہوگی۔" (ص۶۳)

کیا اس کے بعد بھی آپ کے سوالات کا کوئی جواز باقی رہ جاتا ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ مہر کے سلسلے میں جو بھی معاملہ ہو صفائی کے ساتھ ہو۔ ابہام اور مغالطے اور دھوکے کا اس میں دخل نہ ہو۔

اگر اب بھی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو ہم مزید کوشش سمجھانے کی کرتے ہیں۔ آپ کو سمجھانے میں ہمیں کامیابی نہ ہوئی تو بہر حال دوسرے قارئین تو اس سے فائدہ اُٹھا ہی سکیں گے۔

شریعت کی نگاہ میں عقدِ نکاح ایک عبادتی حیثیت رکھنے کے باوجود مالی رُخ سے ایک مخصوص کاروباری معاملہ ہے جس میں مرد خریدار ہے۔ عورت فروخت کنندہ۔ عورت اور مرد کے سرپرست ان کے مشیر اور جو شے بِک رہی ہے اس کا فقہی نام ہے بُضع۔ ہم بستری کے حق کو فقہ میں "مِلکِ بُضع" کہتے ہیں۔ مرد اللہ اور رسول ؐ کے بتائے ہوئے مخصوص قواعد کے ساتھ ایک عورت کے جسم پر تصرف کا جو حق حاصل کرتا ہے اس کی قیمت ہے مہر۔ اور دوسری جو ذمہ داریاں اور خدمات عورت پر عائد ہوتی ہیں ان کا بدلہ ہے نان نفقہ۔

اب یوں غور کیجئے کہ آپ ایک تاجر ہیں۔ اللہ نے آپ کو حق دیا ہے کہ اپنا مال نقد بیچیں اور خریدار جبتک قیمت ادا نہ کرے ہرگز کوئی شے اسے نہ دیں۔ یہ ایک معقول بات ہے لیکن اسی کے ساتھ اللہ نے یہ بھی آپ کے لئے جائز کر دیا ہے کہ جسے مناسب سمجھیں اُدھار بیچ دیں کیونکہ پوری دنیا کے تجربات شاہد ہیں کہ کاروبار میں قرض کے بغیر کام نہیں چلتا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی کاروباری ایسا ملے جو کبھی کوئی چیز قرض فروخت کرتا ہی نہ ہو۔ بہر حال شریعت مجبور نہیں کرتی کہ آپ قرض بیچیں لیکن اختیار دیتی ہے کہ جی چاہے تو قرض بھی فروخت کر دیں۔

اب اسی پر عقدِ نکاح کو قیاس کیجئے۔ عورت کو بلاشبہ حق ہے کہ جو چیز وہ فروخت کر رہی ہے اسے قرض نہ دے بلکہ دست بدست قیمت وصول کرلے۔ مگر اسی کے ساتھ اسے یہ بھی حق ہے کہ کسی وقتِ مقررہ کا تعین کر کے قیمت قرض رہنے دے اور یہ بھی حق ہے کہ وقت کا تعین ہی نہ کرے اور یوں سوچے کہ جب تک عقدِ نکاح قائم رہے گا نان نفقہ شوہر کو ادا کرنا ہی ہوگا لہٰذا اچھا ہے کہ میرا پیسہ کسی ایسے وقت کے لئے جمع رہے جب میں طلاق یا شوہر کی موت کے نتیجے میں پیسے کی شدید ضرورت مند ہوں۔

یہ ہے صاف وسادہ صورتِ مسئلہ۔ آپ ہمیں بتایئے کیا ہر تاجر کو اپنے مال کے بارے میں یہ سب حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ کیا وہ جسے چاہے نقد اور جسے چاہے اُدھار بیچنے کا مختار نہیں؟ اگر ہے تو بس یہی حق واختیار شریعت

عورت کو دیتی ہے۔ لیکن خدا جانے آپ نے کس ڈھنگ سے سوچا اور کیا سوچا کہ عجیب و غریب سوالات آپ کے دماغ میں پیدا ہونے لگے۔

مہر کی فوری ادائگی کو ضروری قرار نہ دے کر شریعت نے ہم انسانوں کے لئے بے حد آسانی پیدا کر دی ہے۔ فرض کیجئے میری بیٹی کے لئے دو رشتے ہیں۔ ایک دولت مند کا جو صاحب کردار نہیں اور دوسرا معمولی حیثیت کے لڑکے کا جو صاحب کردار ہے۔ اب اگر عین عقدِ نکاح کے وقت ہی سارا مہر ضروری ہو تو تین میں سے ایک خرابی یقیناً لازم آئے گی۔ یا تو میں صاحب کردار مفلس کو صاف جواب دے کر بے کردار دولت مند کو اپنا داماد بنا لوں یا پھر مفلس بے چارہ کہیں سے قرض لے کر مہر مہیا کرے اور عائلی زندگی کے آغاز ہی میں قرض جیسی مصیبت کا شکار ہو جائے یا پھر میں بہت تھوڑا سا مہر مقرر کر کے اس سے وصول کر لوں اور لڑکی سراسر خسارے میں رہ جائے۔

خوب سمجھ لیجئے۔ مہر کے مؤجّل (غیر فوری) رہنے میں چار بڑے فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ مہر کا وجوب طلاق کی راہ میں ایک رکاوٹ بنا رہتا ہے اور مرد کسی معمولی بات پر لفظِ طلاق زبان سے نکالنے کی جرأت بار ہا مہر ہی کے ڈر سے نہیں کرتا اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ معمولی سی رنجش رفت گذشت ہو جاتی ہے۔

دوسرا یہ کہ ذاتی پیسے کی ضرورت بیوی کو شوہر کی موجودگی میں ہے ہی نہیں کیونکہ اسلام نے مالی ذمہ داریاں مرد پر عائد کی ہیں۔ مہر اگر بوقتِ نکاح نہیں دیا گیا بلکہ مرد ہی پر واجب رہا تو یہ گویا عورت کی ایک جمع ہے جو اُس وقت اس کے کام آسکے گی جب طلاق یا شوہر کی موت اسے رزق کے میدان میں بے سہارا کر دے۔ یہ مہر اگر بوقتِ نکاح اسے دیدیا گیا ہوتا تو اکثر حالتوں میں وہ اس کے پاس سے خرچ ہو جاتا۔

تیسرا یہ کہ مرد پر عورت کا ایک طرح کا دباؤ باقی رہتا ہے۔ آپ دکاندار سے سودا نقد خریدیں تو کسی بھی قسم کا دباؤ اس کا نہ مانیں گے لیکن قرض خریدیں اور یہ قرض آپ کے ذمے باقی بھی رہے جائے تو قدرتاً اس کا کچھ نہ کچھ دباؤ آپ کے ذہن پر رہے گا۔

چوتھے یہ کہ شریعت نے رشتۂ نکاح کو آسان سے آسان تر بنانے کی مبارک کوشش کی ہے۔ ضروری اگر یہی قرار دیدیا جاتا کہ مہر ہر حال میں بوقتِ نکاح ادا کر دیا جائے تو بے شمار گھرانے سخت مصیبت میں پھنس جاتے۔ شادیاں دشوار ہو جاتیں اور اکثر حالتوں میں مہر اتنا کم رہ جاتا کہ نہ ہونے کے برابر۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ لمبے چوڑے جہیز اور مالی مطالبات کی ملعون رسموں کو قبول کر کے بے شمار مسلمان گھرانے کس عذاب کا شکار ہیں اور کتنی لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مہر کے معاملے میں فریقین کو اختیار دینا شریعت کی لاجواب حکمت ہے اور اسی حکمت کو ہم نے اپنے اُس جواب میں بیان کیا تھا جسے آپ خدا جانے کیا سے کیا سمجھ بیٹھے۔

یہ کس نے کہدیا کہ عین نکاح کے وقت کسی نے مہر ادا کر دیا تو اس پر ہمیں کوئی اعتراض ہے۔ ہم نے جو کچھ کہا ہے اسے مثال سے سمجھئے:۔

آپ ایک منڈی میں دکان لئے بیٹھے ہیں۔ فرض کیجئے اس منڈی کا رواج یہ ہے کہ خریدار بہت سا مال لے جاتے ہیں اور دو ماہ بعد رقم ادا کرتے ہیں۔ یہ رواج ڈھکا چھپا نہیں بلکہ تمام منڈی والوں کے علم میں ہے اور سب اس پر مستقل عمل پیرا ہیں۔ اب ایک گاہک آپ کے پاس آتا ہے اور قرض مال لینا چاہتا ہے۔ آپ کسی وجہ سے یہ پسند نہیں کرتے کہ اسے دو ماہ کے لئے قرض دیں بلکہ آپ کی خواہش یہ ہے کہ اس سے فوراً پیسہ وصول ہو یا محض ایک ہفتے بعد یہ ادائگی کر دے تو کیا عقل اور اخلاق کا صریح تقاضا یہ نہیں ہے کہ اسے مال نکال کر دینے سے پہلے یا ٹھیک دیتے وقت یہ وضاحت فرما دیں کہ مجھے ابھی قیمت لینی ہے یا صرف ایک ہفتے بعد وصول کرنی ہے۔ دو مہینے کی مدت

کے لئے میں قرض دینا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے اگر آپ ایسی کوئی وضاحت نہیں کریں گے اور خریدار مال لے کر چلا جائے گا تو اس کا مطلب ہر معقول آدمی یہی لے گا کہ منڈی کے معروف رواج کے مطابق آپ نے خریدار کو دو ماہ کی چھوٹ بخوشی دیدی ہے اور خریدار بھی اسی اطمینان میں ہوگا کہ رقم اسے ہفتے دو ہفتے میں نہیں بلکہ دو ماہ میں ادا کرنی ہے۔ اب اگر آپ چند روز بعد اس پر تقاضے شروع کردیں اور فرمائیں کہ میں تو مہینے کے اندر اندر اپنا پیسہ لینا چاہتا ہوں تو دین اور دنیا کا کوئی بھی ضابطہ آپ کو حق بجانب نہیں مانے گا۔ خریدار اگر اپنی خوشی سے کل ہی یہ رقم آپ کو ادا کردے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اس پر تقاضے کا حق آپ کو دو ماہ سے قبل نہیں ہے کیونکہ مال دیتے وقت آپ کا سکوت صریحاً یہ معنی رکھتا تھا کہ منڈی کے رواج پر آپ مطمئن ہیں اور دو مہینے ہی کے قرض پر مال دے رہے ہیں۔

بس اسی پر مہر کے معاملے کو قیاس کرلیجئے۔ شریعت نے منڈی والوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ آپ دو ماہ کے قرض پر مال دیا کیجئے۔ اس نے تو بس یہ ضابطہ مقرر کردیا تھا کہ آپ اپنا مال نقد اور قرض دونوں طرح فروخت کرنے کے مختار ہیں ہاں معاملات صاف رہنے چاہئیں اور لین دین میں مغالطوں کا دخل نہیں ہونا چاہئے۔ فلاں منڈی نے دو ماہ کے لئے اور فلاں منڈی نے چار ماہ کے لئے اُدھار فروخت کا طریقہ اختیار کیا یا فلاں منڈی نے نقد ہی فروخت کو شعار بنایا اس سے شریعت کو بحث نہیں۔ اسے تو بس اس سے بحث ہے کہ بائع اور مشتری کے مابین غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔ اسی طرح مہر کے معاملے میں شریعت نے عورت کو مختار بنایا کہ وہ اپنے اولیاء کے نیک مشورے سے نقد اور قرض ہر طرح کا معاملہ کرسکتی ہے۔ مہر نکاح سے قبل لے عین نکاح کے وقت لے یا اسے کسی خاص مدت تک کے لئے قرض رہنے دے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ لیکن جو بھی اس کی مرضی ہو وہ نکاح سے قبل ہی فریق ثانی پر ظاہر ہونی چاہئے۔ اس مرضی کے اظہار اور معاملہ کے انعقاد میں کوئی ابہام اور اینچ پینچ نہیں ہونا چاہئے۔ شریعت کسی کنبے کو مشورہ نہیں دیتی کہ آپ کونسا طریقہ پسند فرمائیں۔ اس نے آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اپنی زمانی ومکانی مصالح کے پیش نظر کوئی بھی کنبہ اور خاندان مہر کے معاملے میں نقد یا قرض کا جو بھی طریقہ اپنے لئے پسند کرتا ہے اختیار کرلے۔ اب اگر ایک کنبہ یہی طریقہ اختیار کرتا ہے کہ اس کی لڑکیوں کے مہر شوہر پر قرض رہا کریں اور ان کی ادائگی کا مطالبہ طلاق یا موت سے قبل نہ ہو تو اس میں شریعت کا کیا قصور ہے۔ شریعت کی طرف سے اس طریقے کو اختیار کرنے کا دباؤ نہیں دیا گیا ہے۔ وہ بس اتنا کہتی ہے کہ جب کسی کنبے نے اپنی مرضی سے یہ طریقہ اختیار کیا اور کافی زمانے کے تعامل سے لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ اس کنبے کا رواج یہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کنبے کا اگر کوئی فرد یہ چاہے کہ اس کی بیٹی کا مہر اس رواج کے خلاف عین نکاح کے وقت یا نکاح سے مہینہ بھر بعد یا فلاں وقت وصول ہوجائے تو وہ فریق ثانی سے صاف صاف اپنا منشاء کہدے اور وہ راضی ہوجائے تو نکاح کردے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا بلکہ کسی بھی قسم کی وضاحت اور معاملت کے بغیر اسی طرح نکاح کردیگا جس طرح اس کنبے کے دوسرے لوگ کرتے آرہے ہیں تو عقل اور نقل دونوں کے تقاضوں کے مطابق یہی مانا جائے گا کہ اس نے کنبے کے دستور پر صاد کردیا ہے۔ یہ گویا اسی طرح ایک خاموش معاہدہ ہوگا جس طرح منڈی والی مثال میں دکاندار اور گاہک کے مابین خاموش معاہدہ تھا کہ قیمت دو ماہ بعد ادا ہوگی۔ لہٰذا عورت یا اس کے سرپرستوں کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ شادی کے چند ہی روز یا چند ہی ماہ بعد مرد کے پیچھے ڈنڈا اٹھائے پھریں کہ لاؤ مہر دو مہر۔

بینک کے فکس ڈیپازٹ میں آپ سال بھر کے معاہدے

پر ایک رقم جمع کرتے ہیں تو کیا کسی بھی ضابطے سے آپ کو یہ حق مل سکتا ہے کہ سال تمام ہونے سے قبل ہی رقم مانگنے لگیں۔ ہرگز نہیں۔ بس اسی طرح مہر کا معاملہ ہے کہ جو بھی طے کرو صاف صاف طے کرو اور طے جو کچھ کیا ہے اس کے خلاف کرنے کا کسی کو بھی حق نہیں۔

اب آپ ہمارے معترض فیہ جواب کو پھر پڑھیے وہاں اسی تفصیل کا خلاصہ ہے۔ اس پر کوئی ہوشمند آخر کیا اعتراض وارد کر سکتا ہے۔ آپ کی جملہ اینِ وآں قطعاً غیر ضروری ہے۔ رہا یہ فرمانا کہ شوہر کی وفات کے بعد بیوہ کس سے رقم وصول کرے گی؟ تو تعجب ہے کہ آپ کو دین و دنیا کا یہ معروف ترین قانون بھی نہیں معلوم کہ کوئی شخص مر جائے تو اس کا قرض اس کے ترکہ سے وصول کیا جاتا ہے۔ آپ بھی تو کبھی کوئی چیز کسی دکان سے اُدھار لیتے ہوں گے یا کچھ پیسے بطور قرض کسی سے لینے کی نوبت آتی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ جس وقت آپ قرض لے رہے ہیں آپ کو یا کسی کو بھی نہیں معلوم کہ آنجناب کل زندہ ہوں گے یا مر جائیں گے۔ فرض کیجئے آپ نے چھ ماہ کے لئے زید سے سو روپے قرض لئے اور پانچویں مہینے ادائگی کے بغیر ہی انتقال فرما گئے۔ اب اگر آپ کے ورثاء آپ کے ترکے میں سے یہ سو روپے زید کو ادا کر دیتے ہیں تو کیا اس پر دنیا کا کوئی بھی معقول آدمی بایں طور معترض ہو گا کہ بیچارے صاحب قرض تو لیا تھا مرحوم نے اور ادائگی کرائی جا رہی ہے دوسروں سے۔

محترم بھائی۔ جب شوہر مر گیا اور عورت کا مہر اس کے ذمے باقی ہے تو شوہر کا ترکہ ورثاء میں تقسیم بعد میں ہو گا پہلے یہ قرض ادا کیا جائے گا۔ یہ قرض کسی اور کے نہیں بلکہ مرحوم شوہر ہی کے مال سے ادا ہو گا۔ یہ کس بے وقوف نے آپ سے کہہ دیا کہ نکاح تو ہو زید کے ساتھ اور مہر ادا کرے بکر۔ توبہ کیجئے۔ شوہر اگر بغیر مال چھوڑے مر گیا ہے تو عورت کسی سے بھی اپنے قرض کا مطالبہ نہیں کر سکتی بلکہ اسے اسی طرح صبر کرنا ہو گا جس طرح دنیا کے اور قرض لین دین میں صاحبِ مال کو کرنا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے آپ نے زید کو ہزار روپے قرض دیئے اور وہ ادائگی کے بغیر مر گیا تو آپ اپنا قرض اس کے ترکے ہی سے تو وصول کریں گے اور اگر اس نے ترکہ نہیں چھوڑا ہے تو صبر کر کے بیٹھ رہیں گے یہ تو قرض دیتے وقت خود آپ کے سوچنے کی بات تھی کہ زید مر گیا تو کیا ہو گا۔ اسی طرح مہر کے معاملے میں عورت کو نکاح سے قبل سوچنا چاہئے کہ شوہر صاحب مر گئے تو مہر کا کیا بنے گا۔ اگر وہ یہی گمان کرتی ہے کہ شوہر صاحب مفلس قلاش مر جائیں گے اور میرا مہر نہ مل سکے گا تو شریعت نے کب اسے مجبور کیا کہ تم اُدھار مہر پر نکاح کرو۔ ٹھیک ہے تم نکاح سے پہلے طے کر لو کہ مہر عقدِ نکاح کے وقت یا فلاں وقت وصول کر لیا جائے گا۔ تم جائز حدوں میں جو چاہے معاملہ کرو شریعت اس سے نہیں روکتی۔ لیکن تم ہی بوقت نکاح تو صاف صاف معاملہ کرتے نہیں اور پھر شوہر بحالتِ افلاس میں مر جاتا ہے تو مہر نہ پا سکنے کا رونا روتے ہو یہ کیا معاملہ ہے۔

اگر عورت مہر لئے بغیر مر جاتی ہے تو اب اس کے ورثاء کو حق ہے کہ مہر وصول کریں۔ شوہر کو شریعت حکم دیتی ہے کہ قرض ادا کرے۔ یہ ورثاء کی مرضی پر ہے کہ معاف کر دیں معلوماتِ شریعت دو اور دو چار کی طرح صاف ہیں لیکن کوئی شخص مطالعۂ فقہ کی زحمت ہی نہ اٹھائے اور خواہ مخواہ عقلی تیر تکے چلانے بیٹھ جائے تو ظاہر ہے کہ اسے کوئی بھی مطمئن نہیں کر سکتا۔

بیوی کا زیور

سوال:- (ایضاً)

ایک اور بات جو اگرچہ اس کی بحث تجلی میں نہیں ہے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو شخص اپنی بیوی کو زیور وغیرہ دیتا ہے تو کیا یہ بطور امانت بیوی کے سپرد کرتا ہے اور طلاق دینے کے بعد اس کو واپس لے لیتا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ زیور وغیرہ بیوی کو دینا گویا اس کو اس کا مالک بنا دینا ہے۔ خواہ دیتے وقت اس کی صراحت شوہر نے نہ کی ہو۔ ہاں اگر وہ کہہ دے

کہ یہ زیور بطور امانت تمھارے سپرد کرتا ہوں تو بیشک جب چاہے اسے واپس لے سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ زیور بیوی ہی کے لئے لوگ بنواتے ہیں۔ کوئی مرد تو اس کا استعمال کرتا نہیں ایسی صورت میں زیور بیوی کو دے کر واپس لینا کیونکر جائز ہوگا۔ کیا اس میں بھی رسم و رواج کا لحاظ کرنا ہوگا؟ جہاں یہ رواج ہو کہ طلاق دینے کے بعد لوگ زیور واپس لے لیتے ہوں وہاں یہ جائز ہوگا؟ کیا یہ بھی جائز ہے کہ وہاں لوگ اگر کسی سے قرض لے کر واپس نہ کرنے کا طریقہ بنا لیتے ہوں تو شرعاً ان پر کوئی جرم عائد نہ ہوگا؟ آخری جملے پر دل برداشتہ نہ ہوں۔ میں صرف اس کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مدلل سمجھا سکیں تو بہت ہی احسان مند ہوں گا۔

جوابؔ:-

یہ تو آپ نے بھی مان لیا کہ شوہر اگر زیور دیتے وقت صراحت کر دے کہ یہ زیور امانتاً دے رہا ہوں تو اسے حق رہتا ہے کہ جب چاہے واپس لے لے۔ تو محترم بھائی شریعت بھی اسکے سوا کچھ نہیں کہتی۔

البتہ آپ فقہ کے ایک ضابطے المعروف کالمشروط سے ناواقف ہیں اس لئے صحیح رائے رکھنے کے باوجود غلط راستے پر نکلے جا رہے ہیں۔ شریعت نے آپ کو آزاد چھوڑا ہے کہ بیوی کے لئے جو زیور آپ بنوائیں اسے اپنی ہی مِلک رکھ کر عاریۃً اسے استعمال کرائیں یا مِلک بھی بیوی ہی کی کر دیں۔ شریعت کسی بھی صورت میں آپ پر قدغن نہیں لگاتی۔

اب رواج کی طرف آیئے۔ کسی کنبے میں زیور کے متعلق جو بھی رواج ہوگا وہ عملی نظائر کی بنیاد پر ہی تو ہوگا۔ دس بیس سو پچاس واقعات ایسے ضرور پیش آئے ہوں گے جن سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اس کنبے کے مرد اپنی بیویوں کو زیور عاریۃً دیتے ہیں یا تحفۃً۔ اگر تحفۃً دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیوی مالک ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کنبے کا کوئی بھی مرد اگر بیوی کو زیور دے گا اور دیتے وقت یہ صراحت نہ کرے گا کہ یہ عاریۃً ہے یا تحفۃً تو قدرتی بات ہے کہ یہ بیوی کی مِلک ہو جائے گا۔ اگر شوہر تحفۃً نہیں دینا چاہتا تھا تو اس پر لازم تھا کہ دیتے وقت وضاحت کر دیتا۔ تب بے شک عورت مالک نہ بنتی۔ اسی طرح برعکس۔ اگر عملی نظائر کی بنیاد پر کنبے والے یہ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں جو زیور بیویوں کو دیا جاتا ہے وہ تحفۃً نہیں دیا جاتا بلکہ عاریۃً دیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کنبے کا جو مرد اپنی بیوی کو کوئی زیور دے گا اور کسی قسم کی وضاحت نہیں کرے گا اس کے بارے میں یہی سمجھا جائے گا کہ کنبے کے معروف رواج کے مطابق اس نے عاریۃً دیا ہے تحفۃً نہیں۔ لہٰذا عورت اس کی مالک نہ بنے گی۔

آپ ڈاکٹر سے پوچھتے ہیں مجھے کیا کھانا چاہیئے۔ ڈاکٹر کہتا ہے تیل اور کھٹائی کے سوا سب کچھ کھاؤ۔ آپ اس کا یہ مطلب تو نہیں لیتے کہ ڈاکٹر نے سڑے ہوئے پھل اور کچا گوشت چبانے کی بھی اجازت دیدی ہے۔ اسی کا نام ہے المعروف کالمشروط۔ آپ پہلے سے جانتے ہیں کہ سڑی ہوئی چیزیں کھانا درست نہیں لہٰذا کسی وضاحت کے بغیر بھی یہ چیزیں ڈاکٹر کی اجازت سے خارج ہو جاتی ہیں۔ اسی ح جب کوئی رواج کنبے میں معروف ہو تو جب تک اس سے مختلف کوئی وضاحت نہ کی جائے قدرتاً یہی سمجھا جائے گا کہ صاحبِ معاملہ نے اسی رواج کو قبول کر لیا ہے۔

یہاں اس سے بحث نہیں کہ رواج کیا ہے۔ رواج چاہے زیور عاریۃً دینے کا ہو یا تحفۃً۔ یہ انسانوں کی اپنی پسند کا معاملہ ہے۔ اس میں سے جو بھی صورت کوئی خاندان پسند کرتا ہے شریعت اس کیلئے جواب دہ نہیں۔ آپ جس کنبے کے فرد ہیں فرض کیجئے اس میں رواج یہ ہے کہ زیور عورتوں کو عاریۃً دیا جاتا ہے نہ کہ تحفۃً۔ اب آپ اپنی لڑکی کی شادی اسی کنبے کے کسی فرد سے کرنا چاہتے ہیں اور خواہش یہ ہے کہ جو زیور آپ کی بیٹی کو ملے وہ عاریۃً نہیں تحفۃً ملے۔ تو بے شک آپ کو یہ خواہش

کرنے کا حق ہے۔ شریعت بالکل منع نہیں کرتی۔ مگر کیا شریعت کا یہ کہنا بھی نامعقول ہوگا کہ آپ لڑکے والوں پر کھل کر اپنی خواہش کا اظہار فرما دیں تاکہ وہ غور کر سکیں کہ یہ بات ہمارے لئے قابلِ قبول ہے یا نہیں۔ اگر آپ اظہار نہیں فرماتے تو خموشی کا مطلب اس کے سوا کیا سمجھا جائے گا کہ جو رواج آپ کے کنبے کا ہے اسی کو آپ نے بھی مان لیا ہے۔ پھر یہ کیسے جائز ہوگا کہ بعد میں کسی وقت آپ کی بیٹی یہ دعویٰ کرے کہ شوہر کا دیا ہوا زیور میری مِلک ہے۔

"قرض لے کر واپس نہ کرنے کی" مثال دے کر آپ نے یہ تأثر دیا ہے کہ ایک سنجیدہ مسئلہ میں مذاق اور بذلہ سنجی فرما رہے ہیں۔ اول تو زیور والی بحث کا تعلق قرض سے ہے ہی نہیں۔ شوہر بیوی کو زیور اگر برائے استعمال دیتا ہے تو اسے "قرض دینا" نہیں کہتے۔ یہ عاریت کا معاملہ ہے۔ جیسے آپ اپنا مکان کسی عزیز کو بغیر کرایہ کے از راہِ تعلق رہائش کے لئے دیدیں تو اسے "قرض دینا" نہیں کہیں گے۔ دوسرے یہ کہ واقعات کے مقابلہ میں محال اور فرضی چیزوں کی مثال نہیں دیا کرتے۔ لوگ ایک دوسرے کو بہت سی چیزیں عاریۃً بھی دیتے ہیں اور تحفتہً بھی۔ یہ دنیا بھر میں روز پیش آنے والے واقعات ہیں۔ اس کے برخلاف قرض دے کر واپس نہ لینے کا رواج ازل سے آج تک تو کہیں پایا نہیں گیا نہ پایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ محالِ عادی ہے۔ ایک واہی مفروضہ ہے۔ تمسخر کے قبیل سے ہے۔ لہٰذا اس کی تمثیل پیش کر کے آپ نے متانت کا خون کر دیا ہے۔

پھر چلئے اسی رخ سے لیجئے۔ اگر آپ کے کنبے میں باہمی مفاہمت سے یہ طریقہ رائج کر لیا جائے کہ ایک دوسرے کی ضرورت پر قرض دیا جائے گا اور اسے واپس نہ لیا جائے گا تو بے شک اس کنبے کا وہ فرد شرعاً مجرم نہیں۔ ہوگا جو قرض لے کر واپس نہ دے کیونکہ فی الحقیقت یہ قرض ہے ہی نہیں۔ جس طرح پانی کی عین حقیقت میں سیلان اور پتھر کی عین وضع میں جمود شامل ہے اسی طرح قرض کی عین حقیقت میں یہ بات شامل ہے کہ لینے والا اسے واپس کرے۔ اگر واپسی کا قصہ خود دینے والے نے ختم کر دیا ہے تو یہ ہدیہ، تحفہ، صدقہ جو بھی کہہ لیجئے قرض نہ ہوگا۔

اور اگر کوئی عقل کا دشمن اسے "قرض" کہنے پر اصرار کرے تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شریعت بس یہ ہدایت دیتی ہے کہ تمہارے خاندان میں اگر ایسا رواج ہے اور تم کسی فردِ خاندان کو "قرض" دیتے ہوئے یہ خواہش بھی رکھتے ہو کہ پیسہ واپس ملے تو تمہارا فرض ہے کہ قرض دیتے وقت اس کی وضاحت کر دو اور لینے والا واپسی کی ہامی بھرے تبھی دو۔ اگر تم نے وضاحت نہیں کی اور روپیہ دیدیا تو دین و دنیا کا ہر ضابطہ یہ فیصلہ دینے میں حق بجانب ہوگا کہ یہ روپیہ تم نے اپنے خاندانی رواج کے مطابق فی الاصل اعانتہً دیا ہے واپسی کی نیت سے نہیں دیا ہے لینے والے پر اسے واپس کرنے کی ذمہ داری نہیں ہے نہ تم تقاضے کا حق رکھتے ہو۔

آپ نے جو یہ فرمایا کہ ـــ "میں سمجھتا ہوں" ـ تو محترم بھائی۔ آپ کے یا میرے سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ دنیا کو اللہ نے آپ کی یا ہماری سمجھ کا تابع نہیں بنایا ہے۔ یہ تو ہر ملک اور ہر شہر اور ہر خاندان کی اپنی مرضی پر ہے کہ جائز اشکال میں سے جس شکل کو چاہے اختیار کرے۔ شریعت پابندی بس اتنی عائد کرتی ہے کہ معاملات میں ابہام نہ ہو تو اور وعدوں اور معاہدوں کی خلاف ورزی مت کرو۔

نظریۂ ارتقاء

سوال ۳ :- از:- کبیر الدین فوزان۔ کریم نگر۔

تجلّی جنوری و فروری ۷۳ء میں "نظریۂ ارتقاء" کے سلسلہ میں آپ نے صفحہ ۴۷ و ۴۸ پر جو فتویٰ صادر فرمایا ہے وہ بے دلیل ہے۔ براہِ مہربانی اگر آپ یہ ثابت کر دیں کہ "نظریۂ ارتقاء" اپنے تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ایک

الحادی نظریہ ہے اور اس کا قائل ملحد اور کافر ہے۔
تو میں آپ کا احسان مند ہوں گا، آخر کن نصوص قطعیہ کی بنا پر آپ نے یہ فتویٰ صادر کیا ہے؟ مدلل اور مفصل طور پر اس کی وضاحت فرمائیے۔ اس سے تو ابن خلدونؒ، امام رازیؒ، ابن عربیؒ، ابن مسکویہ، امام باقرؒ، شیخ محمد عبدہٗ، مولانا آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ جیسے تمام بزرگوں کو مغرب زدہ اور ملحد کہنا پڑے گا کیوں کہ یہ حضرات نظریۂ ارتقاء کے قائل ہیں۔

جواب ۳:۔

اگر آپ ہماری تحریروں کو کھلی آنکھوں اور جاگتے ہوئے ذہن کے ساتھ نہ پڑھیں تو کیا حاصل ہماری خامہ فرسائیوں سے۔ ہم دفتر بھی لکھ دیں گے تو آپ کو بے کار رہیں گے۔

ہمارا محولہ بالا جواب پھر پڑھ کر دیکھئے۔ اس میں "نظریۂ ارتقاء" کا لفظ ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔ "نظریۂ ارتقاء" کے مختلف پہلو کیا ہیں ہم نے ان سے کوئی بحث نہیں کی بلکہ ہم نے تو صاف صاف ڈاروِن کے اس نظریہ کا رد کیا ہے کہ انسان بندر کی ارتقاء پذیر شکل ہے اس نظریہ کا نام "نظریۂ ارتقاء" رکھئے یا جو چاہے رکھئے آپ جانیں۔ قرآن صریح و قطعی الفاظ میں بتاتا ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے حضرت آدمؑ کو پھر حضرت حواؑ کو پیدا کر کے دنیا میں بھیجا اور نسلِ انسانی ان ہی سے چلی۔ آپ یا تو بیانِ قرآنی کو مانیں یا ڈاروِن کے مذکورہ نظریے کو۔ ایک کو ماننا دوسرے کے انکار کے مرادف ہوگا۔ پھر بھی کیا یہ کہنے کی ضرورت باقی رہ گئی کہ اس معاملہ میں ڈاروِن کی تصدیق قرآن کی تکذیب ہے، اور قرآن کی تکذیب کو کفر کہتے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ قرآن کے بیانِ صریح کے بعد آپ کونسی نصِ قطعی کے طالب ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ۔

اور یہ جو ناموں کی لمبی فہرست آپ نے پیش فرمادی تو ذرا حوالہ تو دیجئے کہ ان حضرات نے کہاں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ نسلِ انسانی حضرت آدمؑ سے نہیں چلی بلکہ جانور ارتقاء پاکر انسان بن گئے ہیں ہم ممنون ہوں گے اگر یہ نادر انکشاف آپ پایۂ ثبوت تک پہنچا سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو دھوکا لگا ہے۔ عین ممکن ہے "نظریۂ ارتقاء" کے کسی ایسے پہلو کی ان حضرات میں سے کسی نے تصدیق کی ہو جس کا تعلق نسلِ انسانی کے آغاز سے نہ ہو۔ تو بہر حال وہ یہاں خارج از بحث ہے۔ ہماری بحث آغازِ نسلِ انسانی ہی کے نکتے تک محدود ہے۔

ویسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ تو آپ نے چند نام لیے۔ ہم کہتے ہیں کہ دس بیس کروڑ بھی بلکہ دنیا کے سارے انسان بھی متفق ہو کر قرآن کو جھٹلانے لگیں تو قرآن اپنی جگہ اٹل رہے گا اور جھٹلانے والے دوزخ کا ایندھن قرار پائیں گے۔ یہ خدا کا کلام ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا۔

آئندہ جو بھی سوال کیجئے یا اعتراض فرمائیے سوچ سمجھ کر فرمائیے تاکہ آپ کا اور ہمارا قیمتی وقت برباد نہ ہو۔

خونِ نفاس

سوال ۴:۔ از۔ مجیب احمد۔ برن (امریکہ)

قرآن اور سنت کی رو سے کتنے دن کی مدت دی گئی ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی سے حمل ہونے کے بعد مستفید ہوتا رہے۔ ازدواجی معاملات کے تعلق سے کوئی تفصیلی اور آسان کتاب جو آپ کی نظر سے گذری ہو مطلع فرمائیں۔

جواب ۴:۔

وضع حمل کے بعد عورت کو فطرۃً ایک خون آتا ہے اسے خونِ نفاس کہتے ہیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے اور کم سے کم کچھ نہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بس ایک دن آئے۔ دو دن آئے۔ نہ بھی آئے۔ بہرحال جس طرح ایامِ حیض میں صحبت جائز نہیں ہے اسی طرح خونِ نفاس کے دوران جائز نہیں ہے۔ ہاں کسی کو چالیس دن کے بعد بھی خون جاری رہا تو یہ خون نفاس نہیں لہٰذا صحبت کا

جواز ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اطباء اس کا مشورہ نہ دیں گھریلو مسائل کے لئے حکیم الامۃ مولانا اشرف علیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب "بہشتی زیور" گھر میں رکھیں۔

عذابِ قبر

سوال ۵:۔ (ایضاً)

یومِ آخرت کا تصور کیا ہے۔ اگر اعمال کا حساب یومِ آخرت پر ہوگا تو پھر قبر کا عذاب حساب سے پہلے کیسے ہوتا ہے۔ مثلاً:۔ حضرت آدمؑ کے زمانے میں جو گنہگار مرا ہے اور آخرت سے کچھ پہلے جو مرے گا، دونوں کے عذابِ قبر کو سمجھنے میں مشکل ہو رہی ہے۔ کیا عذابِ قبر کی عذابِ جہنم میں سے کمی ہوگی؟

جواب ۵:۔

عالمِ آخر کے بارے میں آدمی صرف اتنا ہی جان سکتا ہے جتنا اللہ اور رسولؐ نے بتا دیا۔ اس سے زیادہ کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ عذابِ قبر کی اطلاع صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم سے ملی ہے لہٰذا اس پر ایمان واجب لیکن اس کی جملہ تفصیلات دو اور دو چار کی طرح انسانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اجمالی ایمان رکھا جائے اور تفصیل اللہ کے سپرد کی جائے۔

یوم الحساب میں اللہ جو فیصلے دے گا وہ تو عدالتی نوع کے ہوں گے۔ یعنی ہر شخص کے اعمالنامے سامنے موجود ہوں گے اور یہ بھی موقع دیا جائے گا کہ ملزمین اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیں تو کہیں۔ ایسا اللہ تعالیٰ اِتمامِ حجت کے طور پر کرے گا۔ بہر حال آپ جانتے ہی ہیں کہ اس کے علم میں تو سب کچھ پہلے سے موجود ہے۔ جو شخص بھی مرا اللہ کے علم میں ہے کہ اس کے اعمال کیا رہے ہیں اور قیامت کے دن وہ کس انجام کو پہنچنے والا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کی فردِ عمل مجموعی طور پر لائقِ سزا ہے ان کے ساتھ قبل قیامت کے عرصے میں بھی سلوک ایسا ہی رہے گا جیسا مجرمین کے ساتھ ہوتا ہے۔

قبر میں آدمی پر کس طرح کیا کچھ گذرتی ہے۔ کتنے دنوں تک اس کے جسم سے روح کا تعلق باقی رہتا ہے اور کب اس کا معاملہ قبرِ دنیا سے ختم کر کے عالمِ مثال یا عالمِ برزخ یا کسی اور مخفی عالم سے جوڑ دیا جاتا ہے ان سوالوں کا شافی اور قطعی جواب ممکن نہیں کیونکہ اللہ نے بندوں کو اس کا تفصیلی علم دینا پسند نہیں فرمایا لہٰذا کنج کاوی کو چھوڑ کر بس اتنا ایمان رکھئے کہ عذابِ قبر بھی ایک سخت مرحلہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس مرحلے سے کامیاب گذارے۔

شرائط امامت

سوال ۶:۔ از۔ عبدالحکیم۔ دربھنگہ۔

میرے ایک بزرگ محترم قاری ہیں، تجوید کے فن کے تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اکثر فرماتے ہیں کہ مسجد کی امامت کے لئے تجوید جاننے والے کو فضیلت ہے۔ اگر ایک عالمِ فن تجوید نہیں جانتا ہے تو اس کی موجودگی میں وہ امامت نہیں کر سکتا۔ وہ حفص کی روایت بیان کرتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ تجوید نہیں جاننے والے کے مقتدی بننے سے احتراز کرتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر عالم تجوید جاننے والا ہے تو اس کو صرف تجوید جاننے والے پر فضیلت ہے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن ایک عالم کو قاری پر فضیلت نہ ہونا مستند معلوم ہوتا ہے۔

براہِ مہربانی شرائط امامت سے مفصل مطلع فرمائیے۔

جواب ۶:۔

جن مساجد میں امام مقرر ہے ان میں کوئی بحث نہیں کیسا ہی لائق فائق مقتدی آجائے مقررہ امام کے پیچھے نماز بلاکراہت صحیح ہوگی۔ ہاں خود امام تکریماً اس شخص کو آگے بڑھا دے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

امام کے لئے کن اوصاف کو دیکھنا اور ترجیح دینا مناسب ہے ان کی ترتیب فقہ حنفی کی رو سے یہ ہے:۔

(۱) سب سے بڑھ کر مستحق امامت وہ شخص ہے جو نماز کے مسائل اچھی طرح جانتا ہو اور جتنی قرأۃ نماز میں مسنون ہے اس پر قادر ہو۔ ضروری نہیں کہ وہ ماہر تجوید بھی ہو۔ متوسط درجے میں صحتِ لفظی کے ساتھ قرأۃ کرنا کافی شافی ہوگا۔ ہاں اس شخص کو فاسق نہ ہونا چاہئے۔

(۲) اس کے بعد وہ شخص جو اچھی آواز رکھتا ہو' اور قرآن ڈھنگ سے پڑھ سکے۔

(۳) اس کے بعد وہ شخص جو صالح پرہیزگار ہو' اور قرآن ڈھنگ سے پڑھ سکے۔

(۴) اس کے بعد زیادہ عمر والا۔

(۵) اس کے بعد زیادہ صاحبِ اخلاق اور متواضع آدمی

(۶) اس کے بعد شکیل و وجیہ آدمی جسے عام محاورے میں خوبصورت کہتے ہیں۔

(۷) اس کے بعد وہ جو عمدہ لباس پہنے ہوئے ہو۔

(۸) اس کے بعد جس کا سر سب سے بڑا ہو۔

ساری ہی صورتوں میں یہ تو بہرحال ضروری ہی ہے کہ وہ بقدرِ نماز قرأۃ پر قادر ہو۔ یہ سب صورتیں ان حالتوں میں ہیں جب امام مقرر نہیں۔ امام مقرر کرنے کیلئے ذیل کی ترتیب بہتر ہے:۔

(۱) عمدہ آواز' عمدہ قرأۃ' چہرہ مہرہ ٹھیک۔ یعنی ایسا کہ اسے دیکھ کر تنفر یا کراہت نہ آئے۔ اگر چہرہ یا مجموعی ہیئت خراب ہے لیکن دیگر وجوہ سے لوگ اس کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں اور محبت رکھتے ہیں تو چہرے اور ہیئت کی خرابی نظر انداز کردی جائے گی کیونکہ شریعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقتدی امام سے بیزار نہ ہوں۔

(۲) عمدہ آواز والا نہ ملے تو بقیہ دونوں اوصاف ڈھونڈیں۔

(۳) یہ بہرحال ضروری ہے کہ وہ فاسق نہ ہو (یعنی کھلم کھلا گناہ کرنے والا) بدعتی نہ ہو (یعنی قرآن وسنت کے احکام سے لاپرواہ ہو کر نئی باتیں نکالنے والا یا نئی باتوں پر عمل کرنے والا) ایسے مشاغل بھی نہ رکھے جو فی ذاتہٖ چاہے جائز ہوں مگر تہذیب و شائستگی کے خلاف سمجھے جاتے ہوں۔ طہارت پسند ہو۔ بدمزاج اور مغلوب الغضب نہ ہو۔

قرآن پڑھنے میں تجوید کی بڑی اہمیت ہے لیکن اتنی بھی نہیں جتنی بعض غلو پسند حضرات سمجھے بیٹھے ہیں۔ اگر تجوید ہی پر نماز کے ہونے نہ ہونے کا مدار رکھ دیا جائے تو پھر تو آج کے کروڑوں عربوں کی نماز ہی نہ ہوگی کیونکہ وہ اللہ کے بندے قاف کو گاف وغیرہ کہنے لگے ہیں۔ تجوید کا ہلکے سے ہلکا درجہ بھی نماز کی صحت کے لئے کافی ہے۔ ہاں اعلیٰ درجہ ہو تو کیا کہنے۔

قومی ترانے کا احترام

سوال:۔ از۔ رضوان احمد۔ اعظم گڑھ۔

کیا قومی گیت' جن من گن' کا احترام ہم لوگوں کو کرنا چاہئے چاہے وہ کہیں بھی گایا جاتا ہو؟

جواب:۔

ضرور کرنا چاہئے۔ نہیں کریں گے تو مجرم قرار پائیں گے اس کا احترام صرف کھڑے ہونا ہے۔ کیا مضائقہ ہے اس میں جب کہ یہ قومی ترانہ ہے۔

ظہورِ مہدیؑ

سوال:۔ (ایضاً)

حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کی بات کہاں تک صحیح ہے اس کی وضاحت ضرور کریں۔

جواب:۔

آپ بالکل فکر نہ کریں۔ انھیں آنا ضرور ہے مگر یہ بالکل ضروری نہیں کہ آپ کو بھی کچھ معلومات ان کے بارے میں مہیا ہوں۔ یہ علماء کی باتیں ہیں۔ آپ اور ہم تو عامی ٹھیرے۔ یہ بہرحال طے ہے کہ جسے آنا ہے وہ آکر رہے گا اور جسے نہیں آنا ہے وہ کبھی نہیں آئے گا۔ جو مسائل گول مول

یا ٹیڑھے ترچھے یا پیچیدہ اور گہرے ہوں ان میں آپ اور ہم جیسے آدمیوں کو ایسی ہی گول مول رائے رکھنی چاہیئے کہ چت بھی اپنی اور پٹ بھی اپنی۔ بھلا مجال ہے کسی کی اس رائے میں غلطی نکال دے۔

مرہونہ مکان سے انتفاع

سوال:۔ از۔ سید محمد عبدالحلیم احمد)

مکان اگر غیر مشروط طور پر (یعنی میعاد آیا بلا میعاد) رہن لیا جائے اور رہائشی اغراض کے لئے اس میں مسکون رہیں یا بہ اخذ کرایہ کسی کو کرایہ پر دیں تو کیا یہ معاملت اور طریق کار شرعاً مباح ہے۔

جواب:۔

شئے مرہونہ سے کسی بھی قسم کا فائدہ اٹھانا سود ہے۔ آپ اس میں رہیں تو مالک کو کرایہ دیں۔ نہیں دیں گے تو بقدرِ کرایہ ماہانہ سود خواری کے مجرم ہوں گے۔ کسی اور کو کرایہ پر دیں تو کرایہ مالک ہی کو پہنچائیں۔ آپ بہر حال اس رقم سے ایک پیسہ بھی زائد کے حق دار نہیں جو آپ نے اس مکان کی ضمانت میں قرض دی ہے۔

●

اشرفیہ بہشتی زیور مکمل ومدلل

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ کی یہ مقبول ترین کتاب اب تک مختلف اداروں سے چھپتی رہی ہے۔ لیکن اب جس شان کے ساتھ چھاپی گئی ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے خصوصاً حضرت مصنفؒ کی سوانح حیات کا اضافہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ایک منفرد اضافہ ہے جس سے دوسرے ایڈیشن خالی ہیں۔

یہ کتاب ہر مسلمان گھرانے میں رہنے کی ہے کیونکہ اس میں روزمرہ کی ضرورتوں کے مسائل موجود ہیں۔ کیا عبادت، کیا گھریلو معاملات، کیا شادی بیاہ، پیدائش، موت وغیرہ کے مسائل، کیا صالح مردوں اور عورتوں کے حالات، کیا انبیاء کے قصے کیا اعلیٰ درجہ کی نصیحتیں، بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں ازراہِ شرم وحیا جن مسائل کو مردوں سے دریافت نہیں کر سکتیں وہ سب آسان اردو میں اس کتاب کے اندر موجود ہیں اور فہرست مضامین کے ذریعہ وہ بہ آسانی انھیں نکال سکتی ہیں۔ دو جلدوں میں مکمل قیمت غیر مجلد بیس روپے ۲۰/- اگر دونوں جلدیں ایک ساتھ مجلد طلب کریں تو بائیس روپے ۲۲/- دو جگہ مجلد چاہیں تو چوبیس روپے ۲۴/- (تاجرانہ مناسب کمیشن کے لئے خط وکتابت سے معاملہ طے کریں)

- شریعت یا جہالت ۱۰/- • تاریخ اسلام کامل ۴۵/-
- حضرت ابو بکر صدیق کے سرکاری خطوط چھ روپے ۶/-
- نوعمر صحابہ اور اقامتِ دین ۱/۲۰ • رسول اکرم کی سیاسی زندگی ۱۰/-
- مولانا مودودی اور تصوف ۲/۵۰ • روحِ تصوف ۳/۷۵
- مومن کی زندگی قرآن کی روشنی میں ۱/۲۵ • تصوف کی حقیقت ۴/-
- فتوح الغیب ۳/۷۵ • عورت کیا کچھ کر سکتی ہے؟ ۲/-
- آداب زیارت قبور ۵۰ پیسے • قرآن وحدیث ۶۰ پیسے
- غنیۃ الطالبین اردو ۲۲/- • انفاس عیسیٰ ۱۸/-
- مکتوبات مجدد الف ثانی (اول) ۱۲/۷۵ • مسنون دعائیں ۶۰ پیسے
- 〃 〃 (دوم) ۱۵/۷۵ • کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟ ۴/-
- مسجد سے میخانے تک (اول) ۵/۷۵ • قرآن اور تعمیر سیرت ۶/- • تفسیر رشیدی ۲/۵۰
- 〃 〃 (دوم) ۲/۵۰ • دیوبند سے بریلی تک ۲/۵۰

مکتبۂ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

بواسیر کا کامیاب علاج

حکیم محمد یامین صاحب کے پچاس سالہ تجربات کا نچوڑ۔ آپ کے مطب سے ہزاروں بیمار ہر سال مستفید ہوتے ہیں۔ آپ کے پچاس سالہ تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ طبِ یونانی میں ایسے ایسے نوادر نسخے موجود ہیں جو مرض کو دُور کرنے میں آبِ حیات کا حکم رکھتے ہیں۔

حبِ بواسیر مجرّب

حکیم صاحب کا ایک ایسا عطیہ ہے جس پر طبِ یونانی بجا طور پر ناز کرسکتی ہے۔ بواسیر بادی ہو یا خونی، دونوں میں یہ گولیاں مفید ثابت ہوتی رہی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ آپ بھی اس موذی مرض سے چھٹکارا پانے کے لئے اس کا استعمال کریں۔ پورے کورس کی قیمت مع محصول — دس روپے۔

منگانے کا پتہ

حکیم شاہد تحسین۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

عامر عثمانی

دعائیں وسیلہ

تجلی جنوری و فروری ۱۹۶۳ء (ڈاک نمبر دوم) میں ایک محترم صوفی صاحب کے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے ہم نے بزرگوں کے وسیلے سے دعا مانگنے کے سلسلہ میں اپنی الجھن کا اظہار کیا تھا۔

اس پر ایک کرم فرما نے طویل مکتوب لکھا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"شریعت وطریقت کے مسائل میں امت مرحومہ الجھی ہوئی ہے۔ اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر فریق مسئلہ کی وضاحت کرتا ہے اور حیرت یہ ہے کہ ہر فریق اپنے اپنے دعوے کے ثبوت میں احادیث رسول پیش کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے عامۃ المسلمین حیران ہیں توسل کا مسئلہ بھی انھیں مسائل میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں آپ نے بھی اپنے مسلک کی وضاحت فرمائی ہے یا اللہ اور رسولؐ کے مذہب وشریعت کو پیش کیا ہے۔ یہ تو خدا ہی کو بہتر معلوم ہے۔ حق کس کے ساتھ ہے۔ پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ بعض ضروری امور گذارش کریں اور آپ سے رہنمائی چاہیں"۔

صاحب مکتوب کے پیش فرمودہ "ضروری امور" پر گفتگو تو ابھی ہم کریں گے مگر پہلے ان سطور کا جواب عرض کردیں حیرت نام ہے عدم علم کا۔ ایک واقعہ پیش آئے اور آدمی لاعلمی کی بنا پر اس کی صحیح توجیہ نہ کرسکے تو اسے "حیرت" کہتے ہیں۔ آپ کو اگر پوری طرح معلوم ہوتا کہ بہتیرے مسائل میں خود صحابہ کرام کے مابین خیال ورائے کے اختلافات پیدا ہوئے اور پھر محدثین وفقہاء کے درمیان بھی پائے گئے تو پھر آج کے علمی اختلافات پر حیران نہ ہوتے۔ یہ امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ وغیرہم جو ہزاروں مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ سب بھی اپنے اپنے موقف ومسلک کے لئے حدیث وقرآن ہی پیش کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس اختلاف کوئی حیران کن اور نادر چیز نہیں بلکہ اللہ نے اذہان کی ساخت ہی ایسی

متنوع رکھی ہے کہ وہ تمام معاملات میں ایک طرح نہیں سوچ سکتے۔ وہ بہتیرے اصول وعقائد میں متفق ہونے کے باوجود ہزاروں فروعات میں مختلف الخیال بھی ہوں گے اسی فطری تقاضے اور طبعی داعیے کی بنا پر اختلاف کو رحمت بتایا گیا ہے جب کہ اس کے پیچھے خلوص ہو، للّٰہیت ہو۔ سلامتی طبع ہو۔ ضد، تعصب اور خود پرستی نہ ہو۔

اس لئے نفس اختلاف پر آپ کو بالکل حیرت نہیں کرنی چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دین کے معاملہ میں نیت کو بالکل خالص کر لیجئے۔ پھر ہر مسئلہ پر اس کے دلائل کی روشنی میں غور کیجئے۔ اللہ نے ہر شخص کو اس کی طاقت اور استعداد کے مطابق مکلّف بنایا ہے۔ آپ ہر اختلافی مسئلہ پر ہر فریق کے دلائل توجہ سے اور پورے اخلاص نیت کے ساتھ فیصلہ کریں کہ فلاں فلاں دلائل مضبوط ہیں اور فلاں فلاں کمزور۔ بس اسی طرح آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور انشاء اللہ آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے کیونکہ وہاں حسن نیت اور جذبۂ حق طلبی کی سب سے بڑھ کر قیمت ہے۔ اسی لئے اللہ کے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ جو مجتہد صحیح رائے تک پہنچتا ہے اس کے لئے دو ثواب ہیں اور جو صحیح تک نہیں پہنچتا اس کے لئے بھی ایک ثواب بہرحال ہے کیونکہ اس نے نیک نیتی کے ساتھ غور وفکر کیا، تحقیق کی، پسینہ بہایا۔ اگر اس کے باوجود اس کی عقل صحیح فیصلے تک نہیں پہونچتی تو وہ معذور ہے اور جذبۂ طاعت کی بنا پر اجر کا مستحق بھی۔

ہم نے اپنے متذکرہ جواب میں کوئی مسلک پیش نہیں کیا ہے۔ آپ دوبارہ اسے غور سے پڑھیں، ہم نے ایک اشکال اور ایک سوال سامنے رکھا ہے اور اس کا حل چاہا ہے۔ جہاں تک مسلک کا تعلق ہے ہم بارہا اس کا اظہار کر چکے ہیں کہ انبیاء و اولیاء کے وسیلے سے دعا جائز ہے بشرطیکہ مقصود صرف برکت ہو اور یہ شائبہ بھی دل میں موجود نہ ہو کہ انبیاء و اولیاء کسی قسم کی کارسازی پر قادر ہیں۔

یہ مسلک ہمارا اس لئے ہے کہ صرف وسیلہ اختیار کرنا شرک کا ہم معنی نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی اگر یہ سمجھے کہ وسیلہ اختیار کرنے سے خیر و برکت ہوگی اور دعا کی قبولیت کا امکان بڑھ جائے گا تو وہ شوق سے اس مباح فعل کو اختیار کرے لیکن اباحت وجواز سے بڑھ کر جب یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہی طریقہ مستحسن بھی ہے اور اسے باقاعدہ آدابِ دعا میں شامل کر دیا جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ رویہ دلیل سے تہی دامن ہے، بلکہ دلائل قویہ اس کے خلاف ہیں۔

اب وہ امور لیجئے جنھیں مکتوب نگار نے ازراہِ حق طلبی پیش کیا ہے۔ امور کیا دراصل انھوں نے "مناجاتِ مقبول کریمی" کا حوالہ دیا ہے کہ اس میں فلاں فلاں صفحہ ملاحظہ کر لیجئے۔ ہماری آسانی کے لئے انھوں نے متعلقہ عبارات کو نقل کر دینے کی زحمت بھی اٹھائی ہے لیکن ہم بجائے نقل کے اصل ہی کو سامنے رکھ کر گفتگو کریں گے۔

"مناجاتِ مقبول" حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی مقبول تالیف ہے، اس میں زمانۂ ممدوح میں ہی بعض اضافات ہوئے اور بعد میں کسی ناشر نے اس میں محمد سراج الحق مچھلی شہری سے کچھ اضافات کرا کر اس کا نام "مناجاتِ کریمی" رکھا۔ اسی کے آغاز میں آدابِ دعا کے عنوان سے جناب مچھلی شہری نے کچھ مفید چیزیں دی ہیں اور تحریر فرمایا ہے کہ یہ تفصیل ہم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے رسالے احکام الدعاء سے ملخصاً اخذ کر رہے ہیں۔

ان آدابِ دعا میں "۸ واں ادب" انھوں نے یہ لکھا:-

"دعا کے وقت انبیاء علیہم السّلام اور دوسرے مقبول وصالح بندوں کے ساتھ توسّل کرنا یعنی یہ کہنا کہ یا اللہ ان بزرگوں کے طفیل سے میری دعا قبول فرما (بخاری)"

مکتبہ الحسنات نے "مقبول دعائیں" کے نام سے ایک کتاب چھاپی، وہ بھی اس وقت ہمارے سامنے ہے

دلچسپ بات ہے کہ اس میں "مناجات مقبول کریمی" سے آداب دعا جوں کے توں نقل کرتے ہوئے مؤلف کتاب مولانا عبدالحی صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ

"یہ حصہ حکیم الامت کی کتاب سے اخذ کیا جارہا ہے"

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ مولانا اپنے قارئین کو یہ اطمینان دلانا چاہ رہے ہیں کہ یہ آداب دعا مولانا اشرف علی کے تحریر فرمودہ ہیں۔ حالانکہ انھیں معلوم ہے کہ یہ مولانا اشرف علی کے نہیں بلکہ محمد علی شہری صاحب کے تحریر فرمودہ ہیں اور انھوں نے اسے حکیم الامت سے نہیں بلکہ مفتی محمد شفیع صاحب کی کتاب سے اخذ کیا ہے۔

ہمارے نزدیک اہل علم وقلم کا ایسا رویہ تلبیس اور غیر ذمہ داری کے تحت آتا ہے۔ بڑا فرق ہے اس بات میں کہ ایک چیز حکیم الامت کی لکھی ہوئی ہو اور اس بات میں کہ وہ چیز کسی اور شخص نے ایک اور صاحب کی کتاب سے اپنے طور پر اخذ کر کے حکیم الامت کی کتاب میں شامل کر دی ہو۔

خیر ہم نے مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ "احکام الدعا" تلاش کیا۔ یہ چند صفحات کا جیبی سائز رسالہ ہے اس میں جوں کی توں وہی عبارت مل گئی جو اوپر نقل ہوئی اس کے بعد مزید تفحص سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب بھی بس ناقل ہی ہیں۔ یہی بات علامہ ابن الجزری شافعیؒ نے حصن حصین میں لکھی ہے۔ خدا جانے ابن الجزری نے بھی کہیں سے نقل کی یا ان کی اپنی تحقیق ہے۔ بہرحال لکھنے والا کوئی ہو چاہے مفتی دوراں اور علامۂ زماں ہو لیکن ہم یہ کہنے کے لئے معافی چاہیں گے کہ اس نے بڑی جسارت اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ روش دراصل تلبیس اور مغالطہ انگیزی کی ہے جو علمی سنجیدگی سے مطابقت نہیں رکھتی۔

جو بھی غیر محقق حصن حصین یا احکام الدعا یا مناجات مقبول کریمی کی منقولہ بالا عبارت پڑھے گا صاف ظاہر ہے وہ یہی سمجھے گا کہ دعا کا یہ ادب واسلوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلیم کیا ہوا ہے اور آپ کی یہ تعلیم بخاری جیسی معتبر کتاب میں محفوظ ہے۔ چنانچہ صاحب مکتوب بھی ایسا ہی سمجھ رہے ہیں اور نجانے کتنے لاکھوں بندگان خدا نے ایسا ہی سمجھا ہوگا۔ ایسی صورت میں مکتوب نگار کو ہماری تحریر سے جو الجھن پیدا ہوتی ہے وہ قابل فہم ہے لیکن اس الجھن کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ ان بزرگوں اور ناقلوں پر ہے جو بلا تکلف ایک ایسا دعوے کئے چلے جارہے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

مناجات مقبول کریمی کے مرتب جناب محمد علی شہری اگر سدادِ مغزی اور دیانت سے کام لیتے تو بغیر کسی لمبی چوڑی تحقیق کے انھیں یہ احساس ہو جاتا کہ اس اٹھارویں ادب کو "بخاری" کے حوالہ سے لکھنا مناسب نہیں ہے کیونکہ خود انھوں نے اس کتاب میں صفحہ ۲۷۸ سے آگے تک جو اضافے کئے ہیں ان میں مولانا اشرف علی کے وعظ "اکسیر الاعمال" سے وہ ٹکڑا بھی نقل کیا ہے جس میں حکیم الامت مولانا اشرف علی وسیلہ کے سلسلہ میں ابن تیمیہ کے موقف سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے دلائل پیش کرتے ہیں۔ اس میں حضرت موصوف کا یہ فقرہ خود محمد علی شہری صاحب نے نقل فرمایا ہے کہ

"گو یہ مسئلہ اجتہادی ہے" (ص ۲۷۹)

اس فقرے کو نقل کرتے ہوئے انھیں چونکنا چاہئے تھا کہ یہ کیا کہا حکیم الامت نے۔ اگر واقعۃً بخاری میں وسیلے کی تعلیم حضورؐ سے منقول ہو تو پھر مسئلہ کا اجتہادی ہونا کیا معنی وہ تو "منصوص" ہوا۔ اجتہادی وہ مسائل ہوتے ہیں جو ہم اور آپ اپنے زور استدلال سے نکالیں اور اللہ یا رسول کا حکم صریح ان میں موجود نہ ہو۔ اگر حدیث موجود ہے تو اجتہاد کا کیا سوال اور اگر حکیم الامت جیسا عالم مسئلہ کو اجتہادی لکھ رہا ہے تو ضرور بخاری کے حوالے میں کوئی گڑبڑ ہے اتنا احساس ہو جانے کے بعد محمد علی شہری صاحب کو بخاری میں

سرمارنا چاہئے تھا اور وہ حدیث ڈھونڈنی چاہئے تھی جس کے بل بوتے پر " ۱۸ دیں ادب " والی عبارت کا جواز پیدا کیا گیا۔

مگر جب آدمی دل و دماغ میں ایک خیال راسخ جمائے ہوئے ہوتا ہے تو بے لاگ تحقیق سے اسے دلچسپی نہیں ہوتی اسی لئے موصوف نے کوئی کاوش نہیں کی اور " اٹھارواں ادب " جوں کا توں مغالطہ پیدا کرنے کے لئے قائم دائم رہا۔ رہے مکتبۃ الحسنات والے تو ان بیچاروں کو کیا کہئے وہ تو نقل میں اس قدر سعادت مند ثابت ہوئے کہ اگر " مناجات مقبول " میں ایک جگہ عَبسیٰ (عین کے فتح سے) چھپ گیا ہے تو انھوں نے بھی عَبسیٰ ہی نقل کر دیا پھر بھلا ان سے یہ امید کیا تھی کہ وہ خود بھی کچھ تحقیق کر لیتے

یہ ترۂ فال تو مشیت نے ہم جیسے نالائقوں ہی کے نام ڈالا ہے کہ محض ناموں سے مرعوب نہ ہوں اور علم و تحقیق کے معاملہ میں اندھے مقلد نہ بنیں۔ چنانچہ اس تقدیر الٰہی کی کارفرمائی تو ہو کر ہی رہے گی۔ بخاری تو کوئی ایسی کتاب نہیں جو خدانخواستہ نایاب ہو گئی ہو۔ ہر دینی دارالمطالعہ اور ہر عربی مدرسے اور ہر وقیع دینی کتبخانے میں مل جائے گی۔ ہم بدقسمتی سے اس کے حافظ تو نہیں ہیں مگر الحمد للہ اسے پڑھ کر بالکل بھول بھی نہیں گئے ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ بخاری میں ایسی کوئی حدیث موجود نہیں اور جس نے بھی انبیاء و صلحاء کے توسل والی بات " بخاری " سے منسوب کر کے لکھی اس نے بے احتیاطی اور جرأت بیجا کا ارتکاب کیا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، بخاری اٹھاؤ اور ہمیں دکھادو یہ حدیث کہاں ہے۔

معاملہ اصل میں ہے کیا۔ یہ ہم بتاتے ہیں۔

بخاری شریف جلد اول ابواب الاستسقاء میں حضرت انس بن مالک روایت کرتے ہیں:۔

ان عمر بن الخطاب کان اذا قحطوا استسقیٰ بالعباسؓ بن عبدالمطلب فقال اللّٰھم انا کنا نتوسل الیک بنبینا[۴] فتسقینا وانا نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا قال فیسقون۔

جب خشک سالی کی بنا پر قحط پڑا تو حضرت عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کے توسل سے دعا کی، انھوں نے کہا کہ اے اللہ پہلے ہم تیرے نبی کے وسیلے سے عرض گذار ہوا کرتے تھے تو تو ہمیں سیراب کر دیا کرتا تھا۔ اب ہم تیرے نبی کے چچا کے وسیلے سے عرض گذار ہیں، لہٰذا ہمیں سیراب فرما راوی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دعا پر سیراب فرمایا باران رحمت نازل کر دی۔

اس حدیث میں " توسل " سے کیا مراد ہے اور امام بخاری اس سے کیا اخذ کرتے ہیں یہ تو بعد میں دیکھئے گا۔ پہلے آپ یہ بہرحال ملاحظہ فرمالیں کہ یہاں کسی فعل رسولؐ یا حکم رسولؐ کا بیان نہیں بلکہ ایک صحابی رسولؐ حضرت عمر کا فعل و قول بیان ہو رہا ہے۔ اس سے کوئی بزرگ کچھ بھی تعلیم اور حکم اخذ کریں لیکن اسے کسی جگہ اس انداز میں بیان کرنا ہرگز درست نہ ہوگا کہ سننے اور پڑھنے والے یہ تصور کرنے لگیں کہ حکم رسولؐ بیان ہو رہا ہے کوئی شخص کسی فعلِ صحابی یا قولِ صحابی سے اپنے مسلک کے لئے دلیل اخذ کرتا ہے تو ٹھیک ہے وہ شوق سے ایسا کرے۔ مگر یہ اجازت اسے کیسے دی جا سکتی ہے کہ اپنے اس اخذ و اجتہاد کو عین تعلیم رسولؐ باور کرانے لگے۔ ایسا کرنا تو علمی فریب دہی کے ہم معنی ہوگا۔ اور بات جب درمیان میں ختمی نرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو تو ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ایسا کرنے کو سوائے گناہ کے اور کیا کہیں گے۔

اب اس روایت کی ہمہ جہتی تحقیق و تحلیل کی طرف آئیے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ امام بخاری اسے کس باب میں لاتے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ ان کے ابواب کیا

خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ باب کا عنوان ہے:-

"سوال الناس الامامَ الاستسقاءَ اذا قحطوا"

(باب اس بارے میں کہ جب خشک سالی ہو تو لوگ امام (خلیفہ) کے پاس آئیں اور اس سے عرض کریں کہ اللہ سے بارش کی دعا فرمائیے)

دیکھا آپ نے امام بخاری اول تو مذکورہ بالا روایت کو کتاب الدعوات میں نہیں لائے جو دعاؤں پر مشتمل ہے بلکہ استسقاء کے ابواب میں لاتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت دوسرے امور و وقائع سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ بارش کی دعا کے ساتھ خاص ہے دوسرے وہ اس سے توسّل وغیرہ کے لئے استدلال درست نہیں سمجھتے بلکہ اس کا یہ مطلب نکالتے ہیں کہ خشک سالی کے وقت لوگوں کو امام وقت سے عرض کرنا چاہئے کہ بارش کی دعا کرے۔ اس پر یہ اعتراض وارد کیا گیا کہ امام وقت (خلیفہ) تو خود حضرت عمرؓ تھے اور انھوں نے حضرت عباس کے وسیلے سے دعا کی تو یہ بات باب کے مطابق کہاں ہوئی۔ اس کا جواب بخاری کے سب سے شہرۂ آفاق شارح حافظ ابن حجر سے انکی فتح الباری میں احادیث صحیحہ کے حوالوں سے سنئے اور تعجب کیجئے کہ حقائق کیا تھے اور توسل کے شائق بزرگوں نے انھیں کیا رنگ دیا ہے۔

ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ ایک صحابی تھے بلال بن الحارث المزنی۔ وہ خشک سالی کے زمانے میں رسول اللہ کی قبر مبارک پر آئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! اپنی امت کے لئے بارش کی دعا فرمائیے۔ وہ خشک سالی کے سبب تباہی سے دوچار ہے، یہ عرض کر کے چلے آئے۔ خواب میں دیکھا کہ حضورؐ فرما رہے ہیں اِئتِ عُمرَ (عمر فاروق کے پاس جاؤ) حضرت عمر اس وقت خلیفہ تھے۔ یہ صاحب ان کے پاس گئے اور خواب عرض کیا۔ حضرت عمرؓ خواب سننے کے بعد لوگوں کو ساتھ لے کر عیدگاہ یا مسجد پہنچے۔ حضور کے چچا عباس ساتھ تھے۔ ان سے کہا کہ آپ اللہ سے بارش کی دعا کریں۔

یہ ہے اصل قصہ۔ بخاری کے عنوانِ باب پر جو عدم مناسبت کا اعتراض کیا گیا تھا اس کا جواب اس طرح بنا کہ حضرت عباس کو چونکہ خلیفہ ہی نے دعا کا حکم دیا اس لئے وہ اس معاملہ میں بمنزلۂ امام کے تھے اور مسئلہ وہی رہا کہ خشک سالی کے وقت لوگوں کو امامِ وقت سے دعا کی درخواست کرنی چاہئے۔

اب ذرا اہل انصاف اور طالبانِ حق اس واقعے کے تمام اطراف و جوانب اور مضمرات و نتائج پر غیر جانبداری سے غور فرمائیں۔ اچھی طرح سمجھ لینے کی بات یہ ہے کہ اوپر جو ہم بخاری کی روایت نقل کر آئے ہیں اس میں وسیلے یا توسل کا مطلب وہ نہیں ہے جو بعض بندگانِ کرام سمجھانے آ رہے ہیں۔ اسی فتح الباری میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ تھے تو خشک سالی کے وقت لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے کہ بارش کی دعا فرمائیے۔ حضورؐ دعا فرماتے بس اسی بات کو حضرت عمرؓ نے ان لفظوں میں ذکر کیا کہ اے اللہ! پہلے ہم تیرے نبی سے توسل کرتے تھے۔ اب ان کے چچا عباس سے توسل کرتے ہیں گویا وسیلے کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ رسول اللہ کی زندگی میں حضرت عمرؓ یا دوسرے صحابہ اللہ سے یوں دعا کرتے ہوں کہ اے اللہ! اپنے نبیؐ کے طفیل ——— یا اپنے نبی کے وسیلے سے بارش عطا فرما دے۔ بلکہ مطلب صرف یہ تھا کہ دعا کے لئے حضورؐ سے عرض کرتے اور حضورؐ دعا فرما دیتے۔ حضورؐ نے جو دعائیں فرمائی ہیں وہ بھی بخاری وغیرہ میں موجود ہیں مثلاً آپ حمد کے بعد فرماتے:

"اے اللہ! تو ہی اللہ ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ ہم محتاج و فقیر ہیں اور تو غنی ہم پر بارانِ رحمت نازل کر"۔

پھر آپ فرماتے :-

"اے اللہ! ایسی بارانِ رحمت دیجئے جو ہمارے لئے سیرابی کا باعث ہو۔ اس سے نقصان نہ پہنچے۔ جلدی عطا فرما دیجئے۔ دیر نہ کیجئے اپنے بندوں کو اور جانوروں کو پانی پلوائیے اور مردہ زمین کو زندہ کر دیجئے **اللھم اسقنا اللھم اسقنا اللھم اسقنا** اے خدا ہمیں سیراب کر، سیراب کر، سیراب کر۔"

غور سے دیکھئے۔ کیا حضورؐ نے حضرت ابراہیمؑ یا حضرت موسیٰؑ یا عیسیٰؑ یا جبریلؑ کسی کا بھی واسطہ دیا؟ اور یہ بھی دیکھ لیجئے کہ خود حضورؐ دعا فرما رہے ہیں نہ یہ کہ صحابہ آپ کے توسل اور طفیل سے دعا کر رہے ہیں۔ ایسی صورت حال کو حضرت عمرؓ نے توسل سے تعبیر کیا اور یہ جو فرمایا کہ "اب ہم تیرے نبی کے چچا عباس سے توسل کرتے ہیں" تو اس کا بھی مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ حضرت عمرؓ نے یا دوسرے صحابہ نے یوں دعا کی ہو کہ اے اللہ اپنے نبی کے چچا عباس کے طفیل اور ان کے وسیلے سے ہمیں بارش دے بلکہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

قد روی عبد الرزاق من حدیث ابن عباس ان عمر استسقی بالمصلی فقال للعباس قم فاستسق فقام العباس فذکر الحدیث

(محمد عبد الرزاق عبد اللہ بن عباسؓ کی روایت سے ناقل ہیں کہ حضرت عمرؓ دعائے باراں کیلئے عیدگاہ پہنچے اور وہاں رسول اللہ کے چچا عباس سے کہا کہ اٹھئے اللہ سے بارش کی دعا کیجئے۔ پس عباس اٹھے (اور دعا مانگی) اس وقت حضرت عمرؓ نے وہی بات کہی جو حدیث میں آئی ہے کہ پہلے ہم تیرے نبی سے توسل کرتے تھے۔ اب نبی کے چچا سے کر رہے ہیں)

* * *

پھر حضرت عباسؓ کی اس وقت کی دعا بھی محفوظ ہے ملاحظہ ہو:-

"اے اللہ! جو بھی آفت نازل ہوتی ہے بندوں کے گناہوں کی ہی وجہ سے نازل ہوتی ہے اور وہ توبہ ہی سے دور ہوا کرتی ہے۔ لوگوں نے دعا کے لئے مجھ سے اس لئے کہا ہے کہ اب تیرے نبی زندہ نہیں ہے۔ اور میرے یہ ہاتھ تیری طرف اٹھے ہوئے ہیں کہ ہم اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں ہمیں بارش سے سیراب کر" (فتح الباری ص۴۱۳ ج۲)۔

دیکھا آپ نے حضرت ابن عباس نے بھی اللہ سے یوں نہیں کہا کہ ہم رسول اللہؐ یا حضرت ابراہیمؑ یا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے طفیل تجھ سے بارانِ رحمت کی طالب ہیں ٹھیک اسی طرح بلا توسل دعا مانگی جس طرح اللہ کے رسولؐ مانگا کرتے تھے اور جیسی تعلیم آپ دیا کرتے تھے۔ دنیا سے رخصت شدہ انبیاء و صلحاء کے توسل سے دعا کا تو کوئی تصور ہی صحابہ کے یہاں نہیں پایا جاتا تھا۔ اور جو بعض روایات دیگر کتب میں اس سلسلہ کی آتی ہیں ان کا مفہوم و مصداق انشاء اللہ ہم آگے بیان کریں گے۔

اب خدارا کوئی فیصلہ کرے کہ توسل سے حدیث بخاری کا آخر کیا جوڑ ہوا جس کی تلقین برابر بخاری کے حوالہ سے کی جا رہی ہے۔ یہ حدیث بخاری والا توسل تو صریح طور پر اس معنی میں ہے کہ کوئی کسی مصیبت کے وقت اپنے دور کے کسی زندہ بزرگ اور صالح انسان سے گزارش کریں کہ آپ ہمارے حق میں اللہ سے دعا فرما دیں۔ اس طریقے کو کوئی بھی قابل گرفت اور لائق اعتراض نہیں کہتا نہ یہاں اس کی بحث ہے۔ یہاں تو بحث یہ ہے کہ ہم اور آپ ان انبیاء و صلحاء کے توسل سے دعا مانگیں جو کبھی کے دنیا سے جا چکے۔ ایسا کرنا جائز ضرور ہے، اگر ذرہ برابر یہ عقیدہ دماغ میں نہ ہو کہ یہ انبیاء و صلحاء کسی بھی قسم کی قدرت و اختیار قبولِ دعا میں رکھتے ہیں۔ لیکن یہ جواز دوسرے دلائل سے ثابت ہوتا ہے۔ مذکورہ حدیث بخاری سے

بہر حال اس کا کوئی تعلق نہیں۔

جو تفصیلات دیگر احادیث صحیحہ کی روشنی میں ہم نے حدیث بخاری کے لئے پیش کیں ان کے ہر ہر جز پر ذرا جاگتے دل و دماغ سے نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔

صحابی رسولؐ بلال ابن الحرث قبر رسولؐ پر آتے ہیں مگر نہ تو یہ چیخ پکار کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسولؐ مدد! ہمیں قحط نے مار ڈالا۔ بارش عطا فرمایئے۔ نہ خدا ہی سے دعا کرتے ہیں کہ اے خدا اپنے رسولؐ کے صدقے بارش عطا کیجئے بلکہ اس بے مثل تصوّرِ توحید کے تحت جو صحابہ میں عام تھا ادب سے عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! آپ دعا فرما دیں۔ اور عرض بھی اس لئے کرتے ہیں کہ خود اللہ کا رسول اپنی حیات میں بتا چکا ہے کہ انبیاء کے اجسام کو مٹی نہیں کھاتی اور ایک خاص قسم کی زندگی انھیں بعد مرگ بھی حاصل رہتی ہے۔ فرشتے رسولؐ کی امت کا درود و سلام اسے پہنچاتے ہیں۔ حاضرین قبر کی گذارشات اس کے کانوں تک پہونچ جاتی ہیں۔ یہی علم و یقین تھا جسکی بنا پر صحابی نے درخواست پیش کر دی۔

اب یہ نہیں ہوتا کہ آواز آئی ہو جاؤ ہم دعا کریں گے بلکہ اللہ خواب میں آپؐ کی زیارت کراتا ہے اور آپؐ فرماتے ہیں کہ جاؤ خلیفۂ وقت عمرؓ کے پاس جاؤ، صحابیؓ عمرؓ کے پاس آتے ہیں اور عمرؓ صرف یہ کرتے ہیں کہ جس طرح بعض مرتبہ رسول اللہؐ دعائے باران کے لئے عیدگاہ پہنچے تھے اسی طرح خود بھی پہونچ گئے اور اب یہ سوچ کر کہ رسول اللہ کے چچا موجود ہیں وہ بہر حال نسبی حیثیت سے ان کے اقرب اور عمر میں بھی ان سے بڑے ہیں لہٰذا کیوں نہ ان سے دعا کرائی جائے۔ چنانچہ گذارش کرتے ہیں کہ دعا کیجئے اور عباس تعمیل کرتے ہیں۔

اگر "توسل" کا مطلب مذکورہ حدیث بخاری میں چند منٹ کے لئے وہی لے لیا جائے جو قیاس سے ایجاد کر لیا گیا ہے تب بھی اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت عمرؓ کسی اور سے تو کیا رسول اللہؐ تک سے توسل ان کی وفات کے بعد جائز نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ رسول اللہؐ کی وفات تو دوسروں کی وفات جیسی تھی بھی نہیں۔ وہ بہر حال کسی خاص معنیٰ میں زندہ بھی تھے۔ پھر بھی حضرت عمرؓ نے گوارا نہ کیا کہ ان کا وسیلہ پکڑیں بلکہ ایک زندہ بزرگ — حضرت عباسؓ سے وسیلہ پکڑا۔

تو عجیب بات ہے کہ حدیث سے محض توسل پر تو استدلال کر لیا جاتا ہے لیکن یہ جو اس سے توسل بالاموات کی نفی ثابت ہو رہی ہے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے — ذرا سوچئے زید دہلی میں ہے وہ کہتا ہے کہ الف کل دس بجے دن میرے پاس تھا۔ آپ اسے تو تسلیم کر لیتے ہیں لیکن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ الف کل دس بجے دن امریکہ یا انگلینڈ یا چین میں نہیں تھا۔ حالانکہ جب آپ نے اس کا دہلی میں ہونا تسلیم کر لیا تو لازماً یہ بھی ماننا ہوگا کہ وہ اس وقت کہیں اور نہیں تھا۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ بعض اہل علم یہ کہنے کی جرأت کر ڈالتے ہیں کہ مذکورہ حدیث اثبات توسل میں تو صریح ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے چچا سے توسل کیا اور یہ بھی فرمایا کہ ہم نبی کی حیات میں ان سے توسل کرتے تھے لیکن اموات سے توسل کی نفی میں صریح نہیں بلکہ خاموش (مسکوت عنہ) ہے

اے اہل انصاف قرآن اٹھایئے۔ سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ ان عورتوں کے بارے میں فرما رہا ہے جنھیں طلاق دی گئی اِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (اگر وہ مطلقہ عورتیں حاملہ ہوں تو انھیں وضع حمل تک نان نفقہ دو)

یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے بارے میں خاموش ہے جنھیں حمل نہ ہو لیکن کیا اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ جنھیں حمل نہ ہو انھیں نو ماہ تک نفقہ نہیں دیا جائے گا۔

قرآن کہتا ہے اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ (اللہ تمہارا

معبود اپنے ہیں کیا اس کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

قرآن کہتا ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ۔ نساء - ۱۱۵ (راہ ہدایت واضح ہوجانے کے بعد بھی جو شخص رسول کی مخالفت کرے گا اور راہ مومنین کے سوا کسی اور راہ پر چلے گا تو ہم اسے اسی راہ کے حوالے کر دیں گے اور پھر اسے جہنم میں ڈالیں گے)

یہ آیت اس بارے میں تو ناطق ہے کہ سبیل مومنین سے کٹنے والے کو دوزخ میں ڈالا جائے گا لیکن یہ تذکرہ اس میں نہیں کہ سبیل مومنین پر چلنا واجب ہے۔ مگر فقہاء نے اسی سے اجماع امت کی حجیت نکالی ہے اور کہا ہے کہ جب سبیل مومنین سے کٹنے کا ثمرہ جہنم ہوا تو یقینی ہے کہ اس کا خلاف واجب و لازم ہو یعنی سبیل مومنین پر چلنا واجب ہو۔

اور فرمایا گیا اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (تمہارے لئے روزے والے دنوں کی راتوں میں اپنی عورتوں سے مباشرت حلال کی گئی) یہاں "بیویوں" کا نہیں "عورتوں" کا لفظ بولا گیا ہے۔ مگر کیا بیوی کے سوا بھی اس سے کوئی عورت مراد لی جا سکتی ہے۔ پھر دیکھئے کہ اس آیت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ روزے کی حالت میں کوئی شخص جنابت سے بہرہ ور ہوگا کہ نہیں ہوگا۔ لیکن فقہاء استدلال کرتے ہیں کہ جبکہ سحری کے خاتمے تک مباشرت کی اجازت دی گئی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ روزے میں حالت جنابت روزے کو توڑتی نہیں کیونکہ ایک شخص اگر اس آخری منٹ میں جماع سے فارغ ہوتا ہے جس کے بعد رات ختم ہوجاتی ہے تو وہ قرآن کی اجازت کے مطابق ایک جائز کام کر رہا ہے لیکن اس کے بعد غسل میں جو تھوڑا سا وقت حالت جنابت کا گزرے گا وہ روزے کو فاسد نہ کرے گا

دیکھ لیجئے۔ یہاں کتنا خفی پہلو فقہاء نے نکالا اور اسے بحیثیت قانون شرعی تسلیم کیا گیا۔ اسی طرح کی ہزاروں مثالیں قرآن و حدیث سے لائی جا سکتی ہیں اور اہل علم کے لئے وہ مسلمات میں داخل ہیں کہ بہت سے احکام و ہدایات احادیث کے اشاروں، کنایوں سے یا مفہوم مخالف سے بھی ثابت ہو جاتے ہیں اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (حج کے مہینے جانے پہچانے ہیں) سے یہ مسئلہ نکالا گیا کہ اور کسی مہینہ میں حج کا احرام باندھنا جائز نہیں۔ اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو) سے یہ مسئلہ نکالا گیا کہ صالح اور عادل کی لائی ہوئی خبر کو بلا تحقیق بھی قبول کر سکتے ہو اور بعض حالات میں قبول کرنا واجب بھی ہے۔

تو آخر یہ کیا ستم ہے کہ حضرت عمرؓ کی مذکورہ روایت سے آپ توسل سے تو استدلال فرمائیں لیکن دوسرا جو مفہوم و مدعا اس سے واضح ہے اسے نہ صرف نظر انداز کر جائیں بلکہ دوسرے دلائل کے ذریعہ اسے غلط ثابت کرنے لگیں، ہر معقول آدمی فیصلہ کرے کہ اس روش کو کیسے مبنی بر انصاف اور قابل قبول تصور کیا جا سکتا ہے۔ واضح اور دو ٹوک بات ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کے زیر تذکرہ عمل کو کوئی شخص حجت اور دلیل مانتا ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ حضرت عمر صرف زندوں سے توسل کو جائز تصور کرتے تھے اور مرحوموں سے توسل کو ہرگز مفید نہیں سمجھتے تھے۔ پھر جب واقعہ متعدد صحابہ کی موجودگی میں پیش آیا ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ بھی حضرت عمر کے ہم خیال تھے، ورنہ اگر وہ یہ سمجھتے کہ مرحوموں سے توسل مفید ہے تو ضرور پکار اٹھتے کہ اے عمر یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ رسول اللہ سے پہلے توسل کرتے تھے تو اب کیوں نہیں کرتے اور انھیں چھوڑ کر ان کے چچا سے توسل کرنے کی بدعت کس لئے؟ صحابہؓ نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ بھی قطعی طور پر مطمئن تھے کہ رسول اللہ سے دعا میں توسل ان کی وفات کے بعد درست اور نتیجہ خیز نہیں ہے۔

ہمیں تعجب ہے ان حضرات کی جرأت پر جو اس روایت سے استدلال بھی کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ گذرے ہوئے لوگوں سے توسّل جائز اور نافع ہے مستزاد یہ کہ جناب مجھلی شہری نے اس استدلال کے بعد قرآن کا یہ فقرہ بھی نقل کیا ہے۔

فَهَلْ فِیْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ۔ یعنی — "کیا کسی صاحبِ عقل کے لئے اس میں کوئی نشانی یا حجت ہے"۔

یہاں ایک بے احتیاطی تو یہ ہے کہ انھوں نے قرآن میں ایک حرف فا کا اضافہ کر دیا۔ سورۂ فجر دیکھ لیجئے وہاں فَهَلْ نہیں، صرف هَلْ ہے۔ قرآن کا معاملہ کسی اور کتاب جیسا نہیں، یہاں ایک ایک حرف اور نکتے کی زبردست اہمیت ہے۔ کسی محتاط اور ذمہ دار آدمی کے لئے جائز نہیں ہے کہ کسی ایسی کتاب میں جو زیادہ تر کم علم اور بے علم عوام کے پڑھنے میں آتی ہو، آیت کو جزوِ مضمون بناتے ہوئے کسی حرف کا اضافہ کر دے اور حوالہ تک نہ دے کہ آیت کس مقام سے اٹھائی ہے۔

دوسرے کتنی بڑی جسارت ہے کہ حضرت عمرؓ تو بعد وفات رسول اللہؐ تک کا وسیلہ غیر مفید اور قابلِ ترک سمجھ رہے ہیں مگر مچھلی شہری صاحب ان کی روایت نقل کرنے کے بعد ان تمام لوگوں کو احمق اور محروم العقل باور کرانا چاہتے ہیں جو اموات سے وسیلے کو غیر مفید سمجھتے ہیں کیا اسی جسارت کا نام عقل مندی اور تعظیم اکابر ہے!۔

اسی زیرِ بحث حدیثِ بخاری کے تعلق سے ایک اور بہت بڑے اہلِ علم علامہ شوکانی کے ارشادات پر بھی کچھ عرض کرنا یہاں بے محل نہ ہو گا۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ انبیاء وصلحاء سے ان کی زندگی میں بھی اور بعدِ وفات بھی توسل پکڑنا جائز ہے۔ وہ امام عزّالدین اور امام ابن تیمیہ وغیرہ سے مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ کوئی حرج نہیں، اختلافِ رائے کا انھیں حق تھا۔ لیکن ہم نے ان کا رسالہ الدّرّ النّضید فی اخلاصِ کلمۃِ التوحید پڑھا۔ ہماری سمجھ میں ان کا استدلال نہیں آیا، وہ فرماتے ہیں:—

ان التوسّل بـه	رسول اللہ کے ساتھ توسّل
صلی اللہ علیہ وسلّم	درست ہے ان کی زندگی میں
یکون فی حیاتہ و	بھی اور موت کے بعد بھی —
بعد موتہ و فی حضرتہ	سامنے بھی اور پیچھے بھی — اور
ومغیبہ ولا یخفاك	تم پر مخفی نہیں ہے کہ رسول اللہ
انہ قد ثبت التوسل	کے ساتھ توسل ان کی زندگی میں
بہ صلی اللہ علیہ وسلم	اور ان کی موت کے بعد کسی اور
فی حیاتہ وثبت التوسل	سے توسل صحابہ کے اجماعِ
بغیرہ بعد موتہ	سکوتی سے ثابت ہے کیونکہ
باجماع الصحابۃ اجماعًا	حضرت عمر نے جب ان کے
لعدم انکارھم علی	سامنے حضرت عباس سے
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ	توسل کیا تو کسی صحابی نے اس پر
فی التوسل بالعباس	کوئی اعتراض نہیں کیا۔
رضی اللہ عنہ۔	

اگر قاضی شوکانی زندہ ہوتے تو ہم ان سے عرض کرتے کہ اے کثیر المناقب بزرگ! دلیل دینے سے پہلے یہ تو طے فرما دیجئے کہ نقطۂ بحث کیا ہے۔ آپ لفظ توسل استعمال فرما رہے ہیں اور اس لفظ کے دو مفہوم ہیں۔

ایک یہ کہ ایک شخص یا گروہ کسی زندہ بزرگ سے عرض کرے کہ آپ فلاں معاملہ میں دعا فرمائیں۔ اس پر یہ بزرگ اللہ سے دعا فرما دیں اور عرض کرنے والے بھی ان کے ہمراہ دعا کرتے رہیں۔

دوسرا یہ کہ کوئی شخص بطور خود دعا میں یہ کہے کہ اے اللہ! فلاں نبی یا ولی کے توسل سے میرا فلاں کام بنا دے۔

بحث و گفتگو جو کچھ ہے وہ مفہومِ ثانی میں ہے نہ کہ اول میں۔ مفہومِ اول کے اعتبار سے تو توسل میں کسی کو اختلاف نہیں اور سارے مسلمان روزانہ پانچ وقت امام کے ساتھ شریکِ دعا ہو کر اور امام کی قرأۃ فاتحہ پر آمین کہہ کر اسی توسل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ لہٰذا دلیل اس کے جواز کی نہیں

بلکہ مفہوم ثانی والے توسل کے جواز کی چاہئے ۔

آنجناب نے مذکورہ عبارت لکھنے سے پہلے خود یہ تسلیم فرمایا ہے کہ :-

وتوسلهم هو استسقائهم بحيث يدعو ويدعون معه فيكون هو وسيلتهم الى الله تعالى والنبي صلى الله عليه وسلم كان في مثل هذا شافعاً وداعياً لهم ۔	رسول اللہ سے دعائے باراں کے سلسلہ میں صحابہ کے توسل کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ دعا کرتے اور صحابہ بھی ان کے ہمراہ دعا کرتے ۔ پس اس طرح رسول اللہ صحابہ کے لئے اللہ کی طرف وسیلہ بن جاتے ۔ حضورؐ کی حیثیت اس صورت میں شفاعت اور دعا کرنیوالے کی ہوتی ۔

(صفحہ ۵)

گویا حضرت عمرؓ نے جو فرمایا کہ اے اللہ ہم تیرے نبی کی زندگی میں نبی کا وسیلہ پکڑا کرتے تھے تو آپ کے نزدیک بھی وسیلہ کا مطلب وہ نہیں تھا جس میں آج بحث ہے بلکہ وہ تھا جس میں بحث ہی نہیں ۔ پھر حضرت عمرؓ کا حضرت عباس سے توسل کرنا بھی ٹھیک اسی خارج از بحث مفہوم میں تھا ۔ انھوں نے بھی یہی کیا تھا کہ حضرت عباس سے دعا کا التماس فرمایا اور حضرت عباس کے ساتھ مل کر صحابہ نے دعا کرلی ۔

پھر جو آپ یہ فرمارہے ہیں کہ متذکرہ حدیث بخاری سے توسل بالانبیاء اور توسل بالصلحاء اجماعاً ثابت ہے تو محترم یہ تو خود آپ ہی کے اعتراف و اقرار کے مطابق اس توسل کا اثبات ہوا جس کا کوئی منکر ہی نہیں ۔ اس توسل کا اثبات نہیں ہوا جو زیر بحث ہے ۔

بڑی حیرت کی بات ہے کہ نیل الاوطار جیسی عظیم القدر کتاب لکھنے والے قاضی شوکانی اپنے استدلال کی اس واضح خرابی کو محسوس نہ فرماسکے اور طویل بحث کی بنیاد ایک ایسے مفروضے پر رکھدی جو دلیل و ثبوت سے تہی دامن ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ نے بھی بوادر النوادر میں قاضی شوکانی کے استدلال کو سراہا ہے ، مگر خود حکیم الامت بھی حدیث بخاری کا وہی مطلب لے رہے ہیں جو واقعتہً اس کا ہے یعنی صحابہؓ اس مفہوم میں توسل نہیں کرتے تھے جو زیر بحث ہے وہ اللہ سے یوں دعا نہیں کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اپنے نبی کے توسل سے ہمیں بارش عطا فرما ، بلکہ وہ حضورؐ سے عرض کرتے تھے کہ آپ دعا فرمائیے ۔ اور حضورؐ کے ہمراہ خود بھی دعا کرتے یا فقط آمین کہتے ۔ بس یہ تھا ان کا توسل اور اسی طرح حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ سے توسل کیا

تو اہل علم و خبر شخصیات کے رعب سے بلند ہوکر خالص حق پرستانہ زاویۂ نظر سے فیصلہ کریں کہ اس صورت میں صحابہ کے عمل اور اجماع سکوتی کا زیر بحث توسل سے کیا تعلق ہوا اور عزالدین یا ابن تیمیہ کا رد اس استدلال سے کیسے ہوسکتا ہے ۔

ہم ایک طالب علم کی حیثیت سے قاضی شوکانی اور حکیم الامت نور اللہ مرقدہما کی خدمت اقدس میں مؤدبانہ عرض کریں گے کہ زیر بحث توسل کے لئے کم سے کم حدیث بخاری میں ہرگز کوئی بنیاد نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث آپ حضرات کے موقف کی تردید اور مانعین توسل کے موقف کی تائید کررہی ہے ۔ اس میں صحابہ کا اجماع جس چیز پر ہوا ہے بداہتہً اس کے دو پہلو ہیں ۔ ایجابی اور سلبی ۔ ایجابی یہ کہ کسی زندہ بزرگ سے توسل جائز ہے اور سلبی یہ کہ کسی مردہ سے توسل جائز نہیں ۔ یہاں تک کہ اس پیغمبر تک سے نہیں جس کی موت عام انسانوں کی موت جیسی نہیں بلکہ ایک گونہ زندگی کا بھی رنگ لیے اپنے دامن میں رکھتی ہے ۔

پھر اسی حدیث سے یہ بھی مستنبط ہوا کہ یہ جو آجکل قبروں پر جاکر یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اے صاحب قبر بزرگ ہمارے لئے فلاں معاملہ میں اللہ سے دعا فرمائیے یہ بھی مفید و بامعنی طریقہ نہیں ہے کیونکہ صحابی رسول بلال ابن الحرث جب رسول اللہ کی قبر پر آپ سے دعا کی گزارش کرتے ہیں تو وہاں بواسطۂ خواب جواب ملتا ہے

کہ عمرؓ کے پاس جاؤ۔ اس کا مطلب بظاہر یہی تو ہوا کہ خود حضورؐ کے نزدیک دعا کرنا زندوں کا کام ہے ــ وہ زندے جو قبر کے باہر موجود ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ خود دعا فرما دیتے جیسے کہ زندگی میں فرماتے تھے یہ نوبت نہ آتی کہ بلال حضرت عمرؓ سے عرض کریں اور حضرت عمر صحابہ کو لے کر عیدگاہ جائیں اور وہاں حضرت عباسؓ سے دعا کرائیں۔

ناظرین کرام اور برادران اسلام! آپ سردارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے استسقاء ابھی ملاحظہ فرما چکے۔ وہ دعا بھی دیکھ لی جو حضورؐ کے محترم چچا حضرت عباس نے کی تھی۔ اب یہ بھی سن لیجئے کہ خود عمر فاروق کی دعا کیا تھی۔

محدث ابن ابی شیبہ اپنے مصنف میں حضرت عائشہؓ صدیقہ سے روایت کرتے ہیں۔

واستسقی عمرؓ بن الخطاب فما زاد علی الاستغفار۔	خطاب کے بیٹے عمر (فاروق) نے طلب باراں کی دعا کی تو محض استغفار پڑھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

دیکھا آپ نے محض استغفار۔ محض گناہوں کی معافی کی درخواست۔ اور آپ کو بہتیرے بزرگ نہ جانے کب سے یہ تأثر دیتے چلے آ رہے ہیں کہ گویا حضرت عمرؓ نے یوں دعا مانگی ہو کہ اے اللہ اپنے پیغمبر کے چچا عباسؓ کے وسیلے سے ہمیں بارش عطا فرما۔

ایک اور دلچسپ بات۔ صاحب حصین حصین بن الجزریؒ نے اسی ادب کو جسے اٹھارویں ادب کے عنوان سے ہم شروع میں نقل کر آئے۔ دو ٹکڑوں میں بیان کیا ہے پہلا ٹکڑا یہ کہ ان یتوسل الی اللہ تعالیٰ بانبیائہ اور اس کے بعد بخاری وغیرہ کا حوالہ دیا، پھر دوسرا ٹکڑا سپرد قلم فرمایا والصالحین من عبادہ اس کے بعد بھی بخاری کا حوالہ دیا۔ اس سے کوئی بھی قاری اس کے سوا کیا سمجھے گا کہ بخاری میں توسل کے ثبوت میں ایک نہیں دو حدیثیں ہیں۔ ایک سے انبیاء کا توسل ثابت ہے اور دوسری سے صلحاء کا۔

لیکن امر واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حدیث فقط وہی ایک ہے جس پر گفتگو چل رہی ہے۔ حضرت عباس سے حضرت عمر کے توسل کو برہان بنایا گیا صالحین سے توسل پر اور حضرت عمر کے اس قول کو کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہم ان سے توسل کیا کرتے تھے، دلیل بنایا گیا انبیاء کے توسل پر۔

اس سے قطع نظر کہ یہ اجتہاد صریح الغلط تھا۔ یہ طرز عمل بجائے خود غیر ذمہ دارانہ ہے کہ ایک روایت کو دو بار دکھایا جائے۔ خواہ دانستہ خواہ نادانستہ۔ اس طرح کا رد یہ بہرحال مغالطہ انگیزی ہی کہلا سکتا ہے، علمی استدلال نہیں کہلا سکتا۔

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں تفسیر روح المعانی کے شہرہ آفاق مصنف علامہ آلوسی کے کچھ ارشادات نقل کر دیئے جائیں۔ سورہ مائدہ کی ۳۵ ویں آیت وَابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

افادات آلوسی

تحقیق کلام اس مقام پر یہ ہے کہ کسی شخص کا کسی شخص سے دعا کی درخواست کرنا ایسا وسیلہ ہے جس کے جواز میں کوئی شک نہیں اور اس طرح کے وسیلہ میں یہ بھی ضروری نہیں کہ طلب دعا کرنے والا آدمی اس آدمی سے کم درجہ ہو جس سے دعا کی درخواست کی جا رہی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زیادہ مرتبہ کا آدمی کم مرتبے کے آدمی سے دعا کو کہے۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ جب ایک بار حضرت عمر نے رسول اللہؐ سے عمرہ کی اجازت چاہی تو اجازت دیتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا کہ اے میرے بھائی اپنی دعا میں ہمیں نہ بھول جانا (لاتنسنا یا اخی من دعائك)

نیز حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو یہ بھی ہدایت کی تھی کہ اویس قرنی سے ملاقات ہو تو ان سے اپنے لئے دعائے مغفرت کرانا (ظاہر ہے اویس قرنی کا درجہ حضرت عمرؓ سے زیادہ تو کیا ان کے برابر بھی نہیں تھا)

پس یہی "وسیلہ" ہے جس کی ہدایت حضورؐ کی طرف سے امت کے لئے ثابت ہے لیکن اگر وسیلہ سے مراد کسی میت یا غائب سے استغاثہ اور طلب دعا ہو تو کسی عالم کو اسمیں شک نہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔ اور یہ ایسی بدعت ہے جس پر سلف میں سے کسی نے بھی عمل نہیں کیا۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم جو مخلوق میں سب سے بڑھکر اعمال خیر کے شائق تھے ان میں سے کسی نے بھی ایسا نہیں کیا کہ غیر زندوں سے کچھ طلب کیا ہو بلکہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کبھی قبر مبارک پر حاضر ہوتے تو بس اتنا کہتے کہ اے رسول اللہؐ السلام علیک۔ اے ابو بکر السلام علیک، اے میرے باپ السلام علیک ــــ (معلوم ہے کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رسول اللہؐ کے پاس پاس ہی مدفون ہیں) اس کے بعد لوٹ جاتے اور سوائے سلام کے نہ اور کچھ کہتے نہ کچھ طلب کرتے، حالانکہ دیکھ لو سردار دوجہاں رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پہلو میں سونے والی دونوں مبارک ہستیوں کا مرتبہ و مقام۔ روئے زمین پر ان سے بڑھ کر مکرم اور معزز کون ہوگا، لیکن صحابی ان سے بھی مانگنے کو جائز نہیں سمجھتے تھے جبکہ یہ دنیا سے جا چکے۔

ہاں اس مقام مبارک پر بے شک دعا جائز و مشروع ہے۔ مگر کیسے۔ صحابہؓ جب یہاں اللہ سے دعا کرتے تو منھ قبر رسولؐ کی طرف نہیں بلکہ قبلہ کی طرف کرتے اور ان میں سے کسی سے کبھی ایسا ظہور میں نہیں آیا کہ دعا کے وقت قبر کی طرف چہرہ کیا ہو حالانکہ یہی وہ قبر ہے جو عرش سے افضل ہے[1].

یہ دعا کا معاملہ ہوا۔ اب سلام کا معاملہ لیجئے۔ امام ابو حنیفہ سے تو یہ مروی ہے کہ سلام پیش کرتے ہوئے بھی رخ قبلہ کی طرف اور پشت قبر کی طرف کی جائے اور بعض احناف کا خیال یہ ہے کہ سلام کے وقت رخ قبر ہی کی طرف کیا جائے۔ صحیح تر بات جو اس مسئلہ میں ہے وہ یہ ہے کہ سلام کے وقت منھ قبر کی طرف کیا جائے اور اور دعا کے وقت قبلہ کی طرف۔ البتہ دعا کے وقت قبر کی طرف پیٹھ کرنے کے بجائے اسے دائیں یا بائیں رکھ لیا جائے۔

اب سوچ لو کہ جب مخلوق کے سردار اور خلاصۂ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے لئے یہ صورت مشروع ٹھیری تو کسی اور کی قبر کے ساتھ اس سے زیادہ کیا معاملہ کیا جا سکتا ہے اور کسی اور صاحب مزار سے کونسی چیز طلب کی جا سکتی ہے۔

بخاری کی روایت میں حضرت عمر کا جو واقعہ مذکور ہے اس میں بلا شبہ توسل سے مراد استشفاع ہے اور استشفاع کہتے ہیں کسی سے دعا اور شفاعت کی درخواست کو۔ نیز اللہ سے یہ عرض کرنے کو کہ آپ میرے معاملہ میں فلاں شخص کی دعا قبول فرما لیجئے۔ اس بات کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت عباس دعا کرتے جاتے تھے اور موجود صحابہ اس پر آمین کہتے جاتے تھے یہانتک کہ بارش نازل فرما دی گئی"۔

"صحابہ کے محاورے اور زبان میں توسل اور توجہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کسی زندہ شخص سے دعا کی درخواست کی جائے۔ رہا ان دوسرے لوگوں کا معاملہ جو توسل سے مراد یہ لیتے ہیں کہ ایک شخص اللہ سے دعا کرتے ہوئے یوں کہے کہ اے اللہ! بجاہ فلاں ــ یا

(باقی ص ۴۳ پر)

[1] ہمیں علامہ آلوسی کے اس خیال سے اتفاق نہیں۔ تاہم سلف میں متعدد علماء ایسے پائے جاتے رہے ہیں جنھوں نے ایسا ہی قول کیا ہے لہٰذا یہ علامہ کا تفرد نہیں ہے۔

شاہ نامۂ اسلام (جدید)

مدت ہوئی جب عاجز نے شاہ نامے کا یہ سلسلہ تجلی میں شروع کیا تھا۔ یہ کتابی صورت میں بھی چھپ چکا ہے مگر کتاب عرصہ ہوا ختم ہوئی اور دوبارہ اس لئے نہ چھپ سکی کہ عاجز کے نزدیک یہ نظرِ ثانی کی محتاج تھی۔ نظرِ ثانی کا وقت یا یوں کہئے توفیق ابھی تک میسر نہیں آئی اور کتنے ہی لوگ برابر کتاب مانگے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا تجویز یہی ہوتی ہے کہ قسط وار اسے پھر سے تجلی میں شائع کیا جائے۔ اس طرح نظرِ ثانی بھی ہو جائے گی۔

عامر عثمانی

وصالِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

تصور میں جنازہ سامنے ہے اور بیٹھا ہوں
بہت محزوں بہت کھویا ہوا بے طور بیٹھا ہوں

تخیل جل رہا ہے سوزِ پنہاں کے شراروں سے
گذرتا جا رہا ہوں میں عرب کے رہ گذاروں سے

یہ وادی نجد کی ہے یہ ثمیرا ہے یہ ابرق ہے
یہ ذوالقصہ ہے سحر ہے بکا ہے یہ میدانِ خنساق ہے[1]

یہ اک سادہ سی بے زینت سی مسجد ہے مدینے میں
دھڑکتا ہے دلِ یُمن و سعادت جس کے سینے میں

پلٹ آیا ہوں تیرہ سو برس پہلے زمانے تک
نظر پہنچی ہے حضرت عائشہؓ کے آستانے تک

جنازہ آہ مت پوچھو کہ یہ کس کا جنازہ ہے
دلِ گیتی میں صدیوں کا پرانا زخم تازہ ہے

[1] یہ سب مدینے کے آس پاس کے مقامات ہیں۔

زباں تک آتے آتے نام، دل پھٹ جائے گا میرا
وفورِ سوز و رقّت سے بیاں کٹ جائے گا میرا

فضا میں گریۂ جبریلؑ کی آواز سنتا ہوں
گدازِ درد میں ڈوبا ہوا اک ساز سنتا ہوں

ہواؤں میں تڑپ ہے، نوحۂ و فریاد و ماتم کی
فرشتوں کے لبوں پر ہچکیاں ہیں گریۂ غم کی

جنازہ ہے یہ اُس بے مثل و یکتا ابنِ آدم کا
خدا کے بعد جو سرتاج تھا بزمِ دو عالم کا

وہ جس نے زندگی کو روحِ حسین زندگی دی تھی
وہ جس نے آدمیّت کو حیاتِ دائمی دی تھی

وہ نقشِ تام و لفظِ آخری کلکِ نبوّت کا
وہ حرفِ مختتم دانائی و عرفان و حکمت کا

وہ جس کا نور تھا در پردہ آدم ساز و آدم گر
فرشتوں نے جبینیں ٹیک دی تھیں جس کے قدموں پر

جو انساں تھا مگر اوصافِ انسانی میں یکتا تھا
بغیرِ اذن، عزرائیل جس کو چھو نہ سکتا تھا

وہی انسان رخصت ہو گیا ہے آج دنیا سے
وہی انمول قطرہ مل گیا ہے آج دریا سے

عجب اک لمحۂ نازک تھا یہ تاریخِ عالم میں
زمین و آسماں ڈوبے ہوئے تھے بحرِ ماتم میں

بیاں ممکن نہیں اصحابؓ کی وارفتہ حالت کا
جو لاوا پھٹ پڑا تھا مومنوں پر رنج و حسرت کا

گلو میں آکے سانسیں رک گئی تھیں جاں نثاروں کی
زبانیں لرزہ براندام تھیں شمشیر داروں کی

ارشادِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ

عمر فاروقؓ جیسا آہنی قلب و جگر والا — شرابِ ہمت و عزم و شکیبائی کا متوالا

اُمنڈتے پھیلتے جذبات کی موجوں میں بہتا تھا — بہ شانِ والہانہ صحنِ مسجد میں یہ کہتا تھا

کہ اے لوگو زبانیں بند کر لو ہوش میں آؤ — وفاتِ مصطفےٰ کا تذکرہ ہونٹوں پہ مت لاؤ

کہے گا جو "محمدؐ چل بسے دنیائے فانی سے" — نہ بچ پائے گا میری تیغِ بُرّاں کی رَوانی سے

یہ کیفیت جسے تم موت کا منظر سمجھتے ہو — غلط فہمی سے جس کو مرگِ پیغمبر سمجھتے ہو

حجابِ عارضی ہے رفتنی ہے جانے والی ہے — یقینِ مرگِ سرکارِ دو عالمؐ کج خیالی ہے

ارشادِ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

اِدھر صدیق اکبرؓ عاشقِ محبوبِ ربّانی — جنھیں کہتا ہے قرآں "غار میں اثنین کا ثانی"[1]

جنھیں حسنِ جہاں آرا سے بے پایاں محبت تھی — بڑی گہری بہت خاموش لافانی عقیدت تھی

شرف جن کو دیا تھا دوستی کا ذاتِ والا نے — مقامِ صدق بخشا تھا جنھیں باری تعالیٰ نے

یہ کہتے تھے اٹھا کر چہرۂ محبوب سے چادر

کہ "اے پیارے نبی اے سیّدی اے پاک پیغمبر

ترا جینا[2] بھی پاکیزہ ترا مرنا بھی پاکیزہ — بقا کی آخری منزل کو طے کرنا بھی پاکیزہ

---

[1] ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ ۱۲ [2] بِاَبِیْ اَنْتَ وَاُمِّیْ طِبْتَ حَیًّا وَمَیِّتًا اَمَّا الْمَوْتَةَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْكَ فَقَدْ ذُقْتَهَا ثُمَّ لَنْ تُصِیْبَكَ بَعْدَهَا مَوْتَةٌ اَبَدًا ۱۲

تری تقدیر تھی جو موت رب نے بخش دی تجھ کو ۔۔۔ نہ اب آئے گی ہرگز موت دوبارہ کبھی تجھ کو"

بمشکل اتنا کہہ کر ڈھک دیا روئے منور کو
کہ اب پیشِ نظر تھا دفن کرنا جسمِ اطہر کو

تعالیٰ اللہ کیا حیرت فزا قانونِ فطرت ہے ۔۔۔ انوکھی شانِ قدرت ہے نرالا رازِ حکمت ہے
وہ فرقِ نازو اندامِ سُبک وہ جسمِ نورانی ۔۔۔ وہ پرتوِ حسنِ لامحدود کا وہ ظلِّ سبحانی

بلاشک آج شایانِ لحد وہ جسمِ نوری تھا
منوں مٹی میں اس کو دفن کردینا ضروری تھا

اجازت اہلِ ایماں کو اگر قرآں نے دی ہوتی ۔۔۔ بیان و بین کی نوحہ گری کی شور و شیون کی
تو ایسا وقت آیا تھا یہ اصحابِ محمدؐ پر ۔۔۔ کہ ہر گوشے سے اُٹھتا گریۂ و فریاد کا محشر
مدینہ حشر زارِ ماتم و فریاد بن جاتا ۔۔۔ ہجومِ شورِ ماتم سے فغاں آباد بن جاتا
مسلسل ہاتھ کی ضربوں سے سینے خون دے اٹھتے ۔۔۔ مسامِ ضبط سے رستے پسینے خون دے اُٹھتے
بہت بینائیاں اشکوں کی طغیانی میں بہہ جاتیں ۔۔۔ بہت عقلیں ہمیشہ کیلئے مفلوج رہ جاتیں
مگر اللہ رے وہ مستِ تسلیم و رضا بندے ۔۔۔ وہ ہر حالت میں طاعت کیش و پابندِ وفا بندے
وہ صبر و شکر کی تابندہ و پائندہ تصویریں ۔۔۔ وہ حلم و ضبط کے خاور کی خاص الخاص تنویریں

نہ اٹھی بے طرح فریاد و زاری بین بال ان کی
گلوں میں رہ گئیں گھُٹ کر مسلسل ہچکیاں ان کی

بروقت انتباہ

زیارت کرکے آئے حضرتِ صدیقؓ مسجد میں
کہ تھی پیشِ نظر اس موت کی توثیق مسجد میں

یہاں حضرت عمرؓ سرگرم تھے ارشادِ سابق میں
اضافے کر رہے تھے پے بہ پے روداد سابق میں

کہا صدیقؓ نے کیا کہہ رہے ہو اے عمرؓ سنبھلو!
غضب ہے بے خبر ہو جائے تم سا باخبر سنبھلو!

یہ وقتِ امتحانِ خاص ہے اللہ والوں کا
خدا کی سمت رُخ پھیرو خدا رفتہ خیالوں کا

یہ کہہ کر سارے مجمع کی طرف روئے سخن پھیرا
بہ شانِ ضبط کامل موجۂ جوئے سخن پھیرا

بہ طرزِ دل نشیں حمد و ثنا کی اور فرمایا
کہ اے وارفتۂ جذبات اربابِ گرانمایہ!

محمدؐ کو اگر اپنا خدا گر دانتے تھے تم!
عبادت کے لئے معبودِ برحق مانتے تھے تم!

تو بیشک آج دامانِ اجل میں سو گئے حضرتؐ
بشر کی شان سے دنیا سے رخصت ہو گئے حضرتؐ

مگر جو پوجنے والے ہیں ذاتِ ربِّ اکبر کے
نہیں ہے شک جنھیں انسان ہونے میں پیمبرؐ کے

وہ سُن رکھیں کہ ذاتِ ربِّ اکبر غیر فانی ہے
وہ زندہ ہے وہ زندہ ہی رہے گی جاودانی ہے

بڑی حیرت ہے قرآنی بیاں کو بھول بیٹھے تم
مقامِ سرورِ کون و مکاں کو بھول بیٹھے تم

تمھاری عقل ابتک تا لبِ عرفاں نہیں پہنچی
بتاؤ کیا تمھیں یہ آیتِ قرآں نہیں پہنچی

لہ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّہٗ مَنْ کَانَ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ اے لوگو! جو شخص محمدؐ کو پوجتا تھا تو بیشک محمدؐ آغوشِ موت میں جا چکے اور جو شخص اللہ کو پوجتا تھا تو وہ مطمئن رہے کہ اللہ تو

"محمد ﷺ باہمہ شانِ رسالت ایک انساں ہیں

بصد اوصافِ یکتائی بشر ہونے میں یکساں ہیں

زمانے میں رسولانِ خدا پہلے بھی ہو گذرے
ہزاروں بندگانِ باصفا پہلے بھی ہو گذرے

اُنھیں آخر کو جانا ہی پڑا دنیا کی محفل سے
کسے ہے رستگاری موت کے قانونِ کامل سے

یہ ایسا کلیہ ہے جس میں استثنا نہیں کوئی
خدا کے ماسوا کامل بقا رکھتا نہیں کوئی

محمد ﷺ بھی اگر آ جائیں اس قانون کی زد میں
مشیّت کی یہی تقدیر ہو حقِ محمد ﷺ میں

تو کیا تم دامنِ ایمان و عرفاں چھوڑ بیٹھو گے؟
خدا کی بندگی کے عہد و پیماں توڑ بیٹھو گے ؟

اگر ایسا[۵۲] کیا تو یاد رکھو غور سے سُن لو
غلط جذبوں سے ہٹ کر عقل و دانائی کے ناخن لو

اگر جہلِ گذشتہ کی طرف تم لوٹ جاؤ گے
خدا کو ایک شمّہ بھر ضرر پہنچا نہ پاؤ گے

خدا سے منحرف ہو کر تمھارا ہی زیاں ہو گا
تمھارے ہی لئے یہ بارِ گمراہی گراں ہو گا

خدائے پاک نقصان و زیاں کی حد سے باہر ہے
بہت اعلیٰ ہے ارفع ہے بہت بالا ہے برتر ہے

مگر ہاں! آزمائش میں جو بندے شکر کرتے ہیں

لبِ تسلیم سے دم مرضیِ مولا کا بھرتے ہیں

انھیں اللہ ان کے شکر کی پوری جزا دے گا
عطائے خاص سے انعامِ تسلیم و رضا دے گا"

---

۵۱ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۔ (آلِ عمران۔ آیت ۱۴۴)

۵۲ آج بھی ایسے لوگ ملتے ہیں جو کسی طرح وصالِ پیمبر ﷺ کو موت سمجھنے کیلئے تیار نہیں۔ یہ مبالغہ آمیز اور غیر صحت مند عقیدت کا نتیجہ ہے۔

انتباہ کا اثر

یہ قرآنی بیاں اللہ اکبر کیا ٹھکانا تھا
لبِ صدیقؓ پر گویا خدائی تازیانہ تھا

ٹھٹھک کر رہ گئے جذبات کے اُمڈے ہوئے طوفاں
سراب آلودہ احساسات کے اُمڈے ہوئے طوفاں

حقیقت آنسوؤں کے جھرمٹوں میں مسکرا اُٹھی
کرن وارفتگی کے بادلوں میں جگمگا اُٹھی

یہ آیت کیا تھی اِک بے کیف و کم پیشین گوئی تھی
وفاتِ مصطفےٰ پر مختتم پیشین گوئی تھی

جھلک تھی اس کے پس منظر میں موجودہ کوائف کی
نمایاں اس سے تھی توحیدِ خالص کی چمن بندی

تعیّن اس میں تھا اِک منزلِ حُبِّ محمدؐ کا
کنارا اس میں تھا اک بیخودی کے سیلِ بیحد کا

بظاہر بستۂ ایّامِ سابق تھا نزول اس کا
کسی شانِ گذشتہ کے مطابق تھا نزول اس کا

سُنا تھا آج سے پہلے بھی اس وحیِ الٰہی کو
رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِ کی روشن گواہی کو

مگر وہ کھو گئے تھے رنجِ بے پایاں کی وادی میں
بظاہر کیا کسر باقی رہی تھی نامرادی میں

محمدؐ کی جدائی کا تصوّر ہائے کیا کہیئے
ہجومِ بے خودی جوشِ تحیّر ہائے کیا کہیئے

سمجھتے تھے متاعِ زندگی جس ماہ پیکر کو
وہی محبوب رخصت ہو گیا تھا زندگی بھر کو

محبّت جسکی رگ رگ میں لہو بن کر سمائی تھی
اُسی کو آج آغوشِ اجل میں نیند آئی تھی

جو ہر سرمایۂ دنیا و مافیہا سے پیارا تھا
وہی آرام گاہِ باغِ جنّت کو سدھارا تھا

یقیں آتا نہ تھا اس حشر ساماں ہجر و فرقت کا
حقیقت خواب بن جانے لگا تھا محبّت کا

محبّت چاہتی تھی ہوش سے نظریں چرا لینا
محبّت چاہتی تھی عقل کی شمعیں بجھا دینا
فضائے ہوش پر چھایا ہوا تھا عشق کا افسوں
خرد کے دل میں دَر آیا ہوا تھا عشق کا افسوں

یہ افسوں حضرتِ صدیق کی آواز نے توڑا
بالفاظِ دگر قرآن کے اعجاز نے توڑا

اچانک جیسے اُٹھ جائے حجابِ درمیاں کوئی
نقابِ منظرِ پنہاں الٹ دے ناگہاں کوئی
سُنا ہو جیسے پہلی بار یہ پیغامِ ربّانی
ہوئی ہو جیسے نازل آج ہی یہ نصِّ قرآنی
حقیقت سخت جانفرسا حقیقت کھل گئی آخر
یقیں کی موج سے گردِ تأمّل دھل گئی آخر
یقیں آیا کہ بے شک عمر بھر کو جا چکے حضرتؐ
سفر بزمِ جہاں سے مستقل فرما چکے حضرتؐ

بہ صد احساسِ مجبوری بصد آشفتہ سامانی
وفاتِ مصطفےٰ مانی نہ جاتی تھی مگر مانی

عمرؓ کہتے ہیں جب یہ آیتِ قرآں سُنی میں نے
رگ و پے میں نئی اِک کیفیت محسوس کی میں نے
قدم کانپے کھڑا رہنا مصیبت ہو گیا مجھ کو
یقینِ ہجرِ سرتاجِ رسالتؐ ہو گیا مجھ کو
یقیں آیا کہ ہنگامِ فراقِ مستقل آیا
گماں پیشِ یقیں مغلوب آیا منفعل آیا
یقیں آیا کہ اب شاہِ ہُدیٰ واپس نہ آئیں گے
جو پردہ گر گیا ہے حشر ہی دن اٹھائیں گے

عامر عثمانی

عامر عثمانی

تفہیم القرآن پر چند اعتراضات

— ۲۰ —

سید صاحب حجاب وغیرہ کی بحث کے ذیل میں دفعتہً علامہ شبلی کی "الفاروق" سے ایک عبارت اٹھا کر اس پر معترض ہوتے ہیں۔ یہ عبارت حضرت عمر فاروقؓ کی اس افتادِ طبع اور مزاج کے بارے میں ہے جو ان کا اپنی اولاد و ازواج کے معاملہ میں تھا۔ سیّد صاحب کا خیال ہے کہ:-

"شبلی خلاف تحقیق یہاں بڑے غیر ذمہ دارانہ جملے لکھ گئے۔" (انوار الباری ص ۱۲۲)

پھر دور تک انھوں نے یہ ثابت کرنے کوشش کی ہے کہ حضرت عمرؓ کا مزاج وہ نہیں تھا جو شبلی نے سمجھا ہمیں یہاں شبلی کا دفاع نہیں کرنا اس لئے تفصیل میں نہیں جاتے مگر اتنا ضرور کہیں گے کہ شبلی کے الفاظ نہ خلاف تحقیق ہیں نہ غیر ذمہ دارانہ۔ ہاں بزرگوں کی جو افسانوی نوع کی تصویریں ہم لوگ اپنے ذہنی فریم میں فٹ کرنے کے عادی ہوگئے ہیں اس کے اعتبار سے بے شک شبلی کے الفاظ قدرے سخت ہیں۔ حضرت عمرؓ کتنے ہی عظیم القدر ہوں مگر کیا اس حقیقت سے بھی انکار ممکن ہے کہ ان کے مزاج میں وہ نرمی اور شگفتگی اور رافت اور گداز کی کیفیت نہیں تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی۔ حضرت ابوبکرؓ میں تھی۔ حضرت عثمانؓ میں تھی۔ یہ اللہ کی خلقت ہے۔ کسی بھی صحابی یا نبی کے مزاج و سیرت کے کسی خاص پہلو کا صحت کے ساتھ بیان کر دینا توہین و تحقیر ہرگز نہیں ہے نہ شبلی نے حضرت عمرؓ کی کیفیتِ مزاج بیان کرکے ان کی اہانت کا ارادہ کیا ہے۔

آگے سیّد صاحب شبلی کے ایک ترجمے کی بھی غلطی نکالتے ہیں۔ حدیث میں حضرت عمرؓ کا یہ قول وارد ہوا ہے۔ کنا فی الجاھلیۃ لا نعد النساء شیئاً فلما جاء الاسلام وذکرھن اللہ رأینا لھن بذالک علینا حقاً۔ اس کا ترجمہ شبلی نے یہ کیا:-

"ہم لوگ زمانِ جاہلیت میں عورتوں کو بالکل ہیچ سمجھتے تھے۔ جب قرآن نازل ہوا اور اس میں عورتوں کا ذکر آیا تو ہم سمجھے کہ وہ بھی کوئی چیز ہیں۔"

سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ:-

"وہ بھی کوئی چیز ہیں" کسی موجود لفظ کا ترجمہ نہیں ہے اور اس کو علّامہ نے اپنی طرف سے لکھ دیا ہے"

اور سیّد صاحب کے نزدیک صحیح ترجمہ یہ ہے:-

"اور اللہ نے ان کا ذکر کیا تو ہم نے اس کے ذریعے ان کے حق کو سمجھا بوجھا جو ان کا ہم پر ہے"

اور اس ترجمے میں وہ بطور توضیح یہ اضافہ فرماتے ہیں کہ

"یعنی اسلامی ہدایات کی روشنی میں ہم نے ان کے حق و مرتبے کو پہچان لیا"

یہ تفصیل ہم نے اہلِ علم کی دلچسپی کے لئے پیش کر دی تاکہ وہ لطف لے سکیں۔ ہم نے جتنی عربی پڑھی ہے اس کی رو سے تو مولانا شبلیؒ کا ترجمہ غلط نہیں ہے بلکہ "کوئی چیز" کا محاورہ بول کر انھوں نے ترجمے کا حق ادا کر دیا۔ جو اعتراض اس پر سیّد صاحب نے کیا وہ کسی ایسے شخص کی زبان سے زیب دیتا تھا جس کی مادری زبان اردو نہ ہوتی۔ اردو محاورات کے جاننے والے تو شاید ہرگز نہ کہیں کہ شبلی کا ترجمہ غلط ہے۔ ہاں سیّد صاحب نے جو ترجمہ اور پھر اس کی تشریح پیش کی وہ یقیناً تکلّف پر مشتمل ہے۔ اگر الفاظ ہی کی پیروی کی جائے تو ترجمہ یہ بنتا ہے:-

"تب ہم نے جانا کہ عورتوں کا بھی ہم پر کچھ حق ہے"

اس میں اور سیّد صاحب کے ترجمے میں اگرچہ لفظاً کوئی خاص فرق نہیں مگر تیور اور بین السطور میں خاصا فرق ہے تاہم اس موضوع پر تفصیلی بحث ہم مولانا شبلیؒ کے وکلاء پر چھوڑتے ہیں۔

مزے دار بات یہ ہے کہ مولانا شبلیؒ پر اعتراض کرتے کرتے دفعتاً سیّد صاحب نے یہ عنوان قائم فرمایا:-

"صحابۂ کرامؓ معیارِ حق ہیں یا نہیں؟"

معلوم ہے کہ یہ بے چارہ "معیارِ حق" کا لفظ جماعتِ اسلامی والوں کی کھال کھینچنے کے سلسلے میں زیرِ بحث آتا ہے مگر یہاں سیّد صاحب نے علّامہ شبلیؒ کی طرف رخ کر کے اس ہوائی بندوق کو داغا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شبلیؒ اکابر صحابہ پر تنقید کے مرتکب ہیں اور انھوں نے حدیثوں کا غلط سلط ترجمہ کر کے امیر المومنین حضرت عمرؓ تک کو مجروح کر دیا ہے۔

یہ الزام کہاں تک درست ہے یہ تو مولانا شبلیؒ کے وکلاء دیکھیں۔ ہم اس الزام کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں اور اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ عنوان دے کر چند سطروں میں سیّد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت دل کے پھپھولے پھوڑنے کی ہے۔ اس کا علمی معیار اتنا پست ہے کہ کسی اچھے طالب علم سے بھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ چہ جائیکہ استاد سے۔

ویسے سیّد صاحب کی آگاہی کے لئے عرض ہے کہ "الفاروق" اٹھارویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے اور جماعتِ اسلامی کا دستور انیسویں صدی عیسوی میں بنا ہے جس سے "معیارِ حق" کا لفظ اکھیڑ کر اچھے اچھے عالموں نے وہ ہاتھا پائی کی ہے کہ الامان والحفیظ۔ چلئے جماعتِ اسلامی کا دستور بنانے والے مولانا مودودی گمراہ ہی سہی لیکن علامہ شبلیؒ کی طرف جس گمراہی اور توہینِ صحابہ کو سیّد صاحب منسوب کر رہے ہیں اسے بھی "دستورِ جماعت" کے کھاتے میں درج کرنا تو کم و بیش ایسا ہی ہے جیسے بعض بریلوی فنکار فتویٰ دیا کرتے ہیں کہ جس نے دیوبندیوں کو مسلمان سمجھا وہ کافر ہوا اور نہ صرف اس کی بیوی اس کے نکاح سے خارج ہو گئی بلکہ اسکے باپ کا بھی نکاح ٹوٹ گیا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس وقت سیّد صاحب کی طبیعت مولانا مودودی کی گوشمالی پر بے تحاشا مائل تھی۔ بے اختیار "معیارِ حق" کی گولی داغ دی اور بھول گئے کہ سامنے تو شبلی ہے مودودی نہیں۔

شبلی کے تخطیے سے فارغ ہو کر سیّد صاحب مولانا ابوالکلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جس طرح مولانا شبلیؒ نے مساواتِ مرد و زن کا نظریہ اپنا کر غلط سلط باتیں کہیں اسی طرح مولانا آزاد بھی عورتوں کی طرفداری میں بے پَر

کی اُڑانے سے باز نہ رہے۔ اپنی تفسیر ترجمان القرآن میں مولانا آزادؒ نے عورت کے حق میں جو کچھ کہا ہے اس کا ایک حصّہ نقل کر کے سیّد صاحب کہتے ہیں کہ "ایسے بے معنی لمبے لمبے دعووں سے آخر کیا فائدہ۔" (صفحہ ۱۲۸)

ہم سردست مولانا آزادؒ کے بھی وکیل نہیں لہٰذا ردّ و قدح نہیں کریں گے مگر یہ بھی ناانصافی ہوگی اگر ہم اپنا یہ تاثر ظاہر نہ کریں کہ مولانا آزادؒ کے جن ٹکڑوں کو سیّد صاحب نے بے معنی اور باطل قرار دیا ہے وہ ہمارے نزدیک حقیقت بیانی اور ژرف نگاہی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اور سیّد صاحب نے یہ بالکل غلط سمجھ رکھا ہے کہ سورۂ یوسف عورتوں کے مکر و فن اور دجل و کید کا اثبات کرنے کو نازل ہوئی تھی۔ استغفر اللہ۔ قرآن کا اتنا غلط فہم حضرت انور شاہؒ کے تلمیذِ ارجمند کے یہاں۔ فیا للعجب۔

حضرت یوسف علیہ السلام جس قدر حسین تھے اور جنسِ مخالف کے لئے جتنی زبردست کشش اللہ نے ان کے اندر رکھی تھی اگر اس سے آدھی بھی حسین کوئی جوان عورت سڑک پر نظر آجائے تو پھر دیکھئے کہ مردوں کی آنکھیں اور چہرے کیا کچھ بولیاں بولتے ہیں۔ سینوں میں کیا کچھ طوفان اٹھتا ہے پھر زلیخا (یا جو بھی اس کا نام رہا ہو) اگر یوسفؑ جیسے جوانِ رعنا کو دیکھ کر وارفتہ ہو جاتی ہے تو یہ ایسی کون سی عجوبہ اور غیر معمولی بات تھی کہ اس کی بنا پر جنسِ عورت ہی مردوں سے زیادہ ہوس کار اور ذلیل مان لی جائے۔

حق یہ ہے کہ سورۂ یوسفؑ متعدد اہم تر اسباق پر مشتمل ہے جس میں ایک بڑا سبق خدا سے ڈرنے والوں کے کیرکٹر کی مضبوطی دکھلانا ہے۔ ایک حسین ترین پیکر کو سامنے پاکر جنسِ مخالف کا کوئی فرد جذبات سے مغلوب ہو جائے یہ تو عامۃ الورود بات ہے۔ مرد عورتوں سے کہیں زیادہ اس کمزوری کا شکار ہیں۔ خاص اور قابلِ ذکر اور نادر بات اگر کوئی ہے تو یہ ہے ایک مسنر عورت خود اپنا جسم پیش کر رہی ہے اور نوجوان مرد کہہ رہا ہے کہ توبہ توبہ۔ میں ایسا گناہ کیسے کروں۔ پھر یہ مرد نہ صرف بھاگ پڑتا ہے بلکہ قید و بند کی تکلیفیں برداشت کرتا ہے مگر اس پر راضی نہیں ہوتا کہ زنا کرے۔ یہی وہ فولادی کیرکٹر اور اسوۂ حسنہ ہے جو اہلِ ایمان کی عبرت اور سبق آموزی کے لئے اللہ نے سورۂ یوسف میں ضمناً پیش کیا ہے۔ جو لوگ۔ خواہ وہ سیّد صاحب ہوں یا مفسرینِ سلف میں سے بعض۔ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس قضیے سے عورتوں کی مکاری اور گراوٹ اور مرد کے مقابلے میں جنسِ اناث کی کمتری دکھلانا مقصود ہے وہ اپنی عقلوں پر ظلم کرتے ہیں بھلا کونسی عجیب و غریب اور پُر اسرار اسکیم بنائی تھی زلیخا نے۔ محض ایک سیدھا سادھا سا قصہ۔ حضرت یوسفؑ وہیں رہتے تھے۔ ایک دن موقعہ پاکر زلیخا نے دروازہ بند کر دیا اور بولی آؤ جلدی سے۔۔۔۔ (ھیت لک۔ قرآن) حضرت یوسفؑ لاحول پڑھتے بھاگے۔ اس نے جھپٹ کر پکڑنا چاہا۔ قمیص کا پچھلا دامن ہاتھ میں آگیا۔ یوسفؑ نے پروا نہیں کی بھاگے چلے گئے پچھلا دامن پھٹ گیا۔ اتفاق سے زلیخا کے شوہر صاحب بھی دروازے ہی پر موجود تھے۔ اب زلیخا یہ نہ کہتی تو اور کیا کہتی کہ یوسفؑ نے میری عزت لوٹنی چاہی تھی۔

اس پوری کارروائی میں کون سی ایسی خاص مکاری یا چال بازی ہے جس کی بنا پر ساری صنفِ لطیف کو مطعون کیا جائے۔ یا کونسا نادر پن ہے۔ ہوس کی کہانیاں تو یومِ اوّل سے چلی آرہی ہیں اور مردوں کی ہوسناکیاں۔ خدا کی پناہ۔ ان کی عیاریوں اور زبردستیوں اور شیطنتوں کا مقابلہ عورت بے چاری کیا کرے گی۔۔۔۔ ہاں یہ واقعی نادر بات تھی کہ یوسفؑ بھاگ پڑے۔۔۔ کروڑوں میں ایک ہی آدھ مرد ایسا مل سکتا ہے جو ایسے موقعہ پر ازراہِ تقویٰ بھاگ پڑے اس طرح یہ داستان دراصل عظمتِ یوسفی کا نقشِ جمیل و نادر ہے نہ کہ عورت ذات کی کسی غیر معمولی پستی کا نقشِ کثیف و عجیب۔

مولانا آزادؒ کے بعد "مولانا مودودی" کا عنوان آیا۔
اب لیجئے ہم بھی ابلیس ہو گئے۔
فرمایا جاتا ہے:۔

"ہم اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ مساواتِ مرد و زن کے اصول کو علامہ مودودی بھی اپنائے ہوئے ہیں وہ بھی نہیں چاہتے کہ عورتوں کی کسی سرشت یا عادت کو برا کہا جائے۔" (ص ۱۳)

محترم سیّد صاحب اگر واقعی زمین ہی پر رہتے ہیں تو کس قدر حیرت ناک ہے یہ بات کہ وہ "مساواتِ مرد و زن" کے معروف اصطلاحی مفہوم و مراد کو نہیں جانتے۔ حالانکہ کوئی بھی عاقل بالغ مشکل ہی سے ہوگا جو نہ جانتا ہو کہ یہ نعرہ صرف دو سادہ سے لفظوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک خاص ذہن اور طرزِ فکر اور تہذیب کا نمائندہ ہے۔ اور پھر یہ بھی غالباً ہر پڑھا لکھا جانتا ہے کہ مولانا شبلیؒ یا مولانا آزادؒ یا مولانا مودودی کوئی بھی اِس ذہنیت کا حامی نہیں بلکہ مولانا مودودی کو تو اس ذہنیت کے صفِ اول کے دشمنوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق کتاب "پردہ" ہمارے دعوے پر شاہدِ عدل ہے اور تفہیم القرآن میں یا اور کسی تصنیف میں جہاں بھی انھیں موقع ملا ہے انھوں نے کھل کر ڈٹ کر شد و مد کے ساتھ اُس تہذیب و تمدن اور اُس فکر و ذہن کے بخیے اُدھیڑے ہیں جس کی ترجمانی "مرد و زن کی مساوات" کے نعرے سے ہوتی ہے۔

پھر بھی اگر سید صاحب مودودی کو اس "اصول" کے اپنانے والوں میں شمار کرتے ہیں تو یہ کم و بیش ایسا ہی ہے جیسے امام ابو حنیفہؒ یا ابنِ تیمیہؒ یا عبد الوہاب نجدیؒ کو قبر پرستوں میں شمار کر لیا جائے۔ یا جیسے کوئی یوں کہے کہ گاندھی جی تشدد کے اور ہٹلر صاحب عدمِ تشدد کے قائل تھے۔

مولانا مودودی کا قصور کیا ہے، یہ بھی سن لیجئے۔ وہ تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۶ پر ایک نوٹ میں لکھتے ہیں

"عام طور پر یہ جو مشہور ہو گیا ہے کہ شیطان نے پہلے حضرت حوّا کو دامِ فریب میں گرفتار کیا اور پھر انھیں حضرت آدم کو پھانسنے کے لئے آلۂ کار بنایا۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ شیطان نے دونوں کو دھوکا دیا اور دونوں اس سے دھوکا کھا گئے۔ بظاہر یہ بہت چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کو معلوم ہے کہ حضرت حوّا کے متعلق اس مشہور روایت نے دنیا میں عورت کے اخلاقی، قانونی اور معاشرتی مرتبے کو گرانے میں کتنا زبردست حصّہ لیا ہے وہی قرآن کے اس بیان کی حقیقی قدر و قیمت سمجھ سکتے ہیں۔"

یہ ہے وہ عبارت جسے سید صاحب نے نقل کر کے عجیب و غریب باتیں کہی ہیں۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے اتنا سُن لیجئے کہ تورات میں یہ روایت آئی ہے کہ شیطان نے حوّا کو بہکایا اور حوّا نے آدم کو۔ مولانا آزادؒ نے اپنی تفسیر میں تحریر فرمایا:-

"اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی خلقت میں مرد سے زیادہ برائی اور نافرمانی ہے اور وہی مرد کو سیدھے راستے سے بھٹکانے والی ہے لیکن قرآن نے اس قصّہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی بلکہ ہر جگہ اس معاملہ کو آدم و حوا دونوں کی طرف منسوب کیا۔"

ہمارے نزدیک مولانا آزادؒ نے صحیح ترین بات کہی مگر سید صاحب ان سے خفا ہیں کہ لیجئے انھوں نے مرد عورت کو برابر کر دیا۔ پھر وہ تفہیم کی مذکورہ بالا عبارت نقل کر کے فرماتے ہیں

"مولانا آزاد نے کچھ احتیاطی الفاظ استعمال کئے تھے کہ قرآن مجید نے اس قصّے کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی لیکن علامہ مودودی نے آگے بڑھ کر یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ قرآن مجید اس کی تردید کرتا ہے اور دلیل تردید کی بھی وہی دی ہے جو عامِ تصدیق کی ہے۔ دونوں کے طرزِ بیان کا معنوی فرق اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں۔" (انوار الباری، جلد دہم، ص ۱۳)

ہمیں اپنے اہلِ علم ہونے کا دعویٰ نہیں لہٰذا اہلِ علم ہی سے گذارش ہے کہ وہ مولانا آزادؒ اور مولانا مودودی دونوں کی مذکورہ عبارتیں پڑھ کر منقح فرمائیں کہ کیا واقعی ان میں کوئی

معنوی فرق اور تخالف ہے۔

الف کہتا ہے زید نے صرف بکر کو مارا۔ جیم اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ بلکہ کہتا ہے زید نے بکر اور طلحہ دونوں کو مارا۔ تو کیا یہی تصدیق نہ کرنا عین تردید نہیں ہوا؟

بائبل بیان کرتی ہے کہ شیطان نے پہلے سانپ کو بہکایا سانپ نے حوّا کو اور حوّا نے آدم کو۔ غالباً یہ عقیدہ تو سیّد صاحب بھی نہ رکھتے ہوں گے کہ موجودہ بائبل قرآن کی طرح حرفاً حرفاً منزّل من اللہ ہے اور اس میں کوئی غلط بات داخل نہیں کی گئی ہے۔ اب ذرا وہ قرآن پر تو نظر ڈالیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم "احتیاط" کے معنی سیّد صاحب کی لغت میں کیا ہیں۔ کیا وہ احتیاط اسے کہتے ہیں کہ جو کچھ قرآن کہہ رہا ہے اسے پورا پورا بیان نہ کرو۔ صاف صاف نہ کہو۔ چبا چبا کے تفسیر کرو۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے بعض مخبوط الحواس کہتے ہیں کہ قرآن بلا سے حضورؐ کو بشر کہتا رہے تم اپنی زبان سے مت کہو۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ "تردید" کی بات بے احتیاطی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ قرآن نے یقیناً اور قطعاً اسکی تردید کی ہے کہ شیطان نے پہلے حوّا کو بہکایا ہو' اور حوّا نے آدم کو۔

آدم و حوّا کا یہ قصّہ قرآن میں تین جگہ آیا ہے سب سے پہلے سورۂ بقرہ میں۔ اللہ کہتا ہے:۔

"شیطان نے آدم و حوّا دونوں کو بہکا دیا (فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا۔ آیت ۳۶)"

سورۂ اعراف میں فرماتا ہے:۔

"دونوں کے دلوں میں شیطان نے وسوسہ ڈالا۔ (فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ۔ آیت ۲۰)

ہر سلیم العقل کے لئے یہی دونوں مقام یہ سمجھنے کیلئے کافی ہیں کہ وہ ساری روایات غلط ہیں جن میں یہ آتا ہے کہ شیطان نے پہلے حوّا کو دھوکے میں ڈالا اور حوّا نے آدم کو۔

لیکن تیسرا مقام تو اس سے بھی زیادہ فیصلہ کن ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں اللہ فرماتا ہے:۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى آدَمَ　　اور ہم نے تاکید کر دی تھی آدم کو اس سے
مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ۔　　پہلے (کہ اس درخت سے نہ کھائے) پھر وہ بھول گیا۔

یہاں حوّا کو اللہ نے نظر انداز ہی کر دیا اور فراموشی کا ذمّہ دار تنہا آدمؑ کو ٹھیرایا ـــــ مزید دیکھئے۔ فرمایا گیا:۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ　　پس جی میں ڈالا آدم کے شیطان نے
قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ　　کہا اے آدم! کیا میں تجھے ایسا درخت
عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ　　بتاؤں کہ اسے کھا کر ہمیشہ زندہ رہے
مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (آیت ۱۲۰)　　اور ایسی بادشاہی جو سدا بہار ہو۔

کیا اس واضح ترین، بے ریب، قطعی کلامِ ربّانی کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مشہور قصے کی تردید نہیں کر رہا ہے۔ کیا مولانا مودودی پر بے احتیاطی کا الزام عائد کرنے والے سیّد صاحب غور فرمائیں گے کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں۔

حق یہ ہے کہ شیطان کے بہکاتے میں تو آئے آدمؑ اور حوّا دونوں، جیسا کہ دو مقام پر اللہ نے فرمایا لیکن یہ تیسرا مقام واضح کرتا ہے کہ شیطان کا اصل خطاب اور رُخ اور روئے سخن آدم ہی کی طرف تھا۔ آنکھیں کھول کر پھر سے دیکھئے کہ اللہ کی تصریح کے مطابق شیطان ہی براہِ راست آدم کو پٹی پڑھا رہا ہے نہ کہ بے چاری حوّا۔ حوّا تو ضمناً دھوکہ کھا گئیں آخر عورت تھیں، عقل و شعور آدمؑ کے مقابلہ میں کم تھا۔ جب آدم ہی فریب میں آ گئے تو وہ کیوں نہ آتیں۔ لیکن آیت آپ کے سامنے ہے اصل فریب خوردہ اور اللہ کی تاکید کو بھول جانے والے حضرت آدمؑ تھے نہ کہ حوّا۔

اسی لئے سورۂ بقرہ میں دیکھئے۔ ذکر حضرت آدمؑ کی توبہ کا ہے حوّا کی توبہ کا نہیں۔ اور سورۂ طٰہٰ میں دیکھئے فرمایا گیا ہے وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (اور آدم نے اپنے رب کی بات نہ مانی پس بے راہ ہو گیا۔ آیت ۱۲۱)

صاف ظاہر ہے کہ اگر واقعہ وہی ہوتا کہ شیطان نے حوّا کو اور حوّا نے آدم کو بہکایا تو حوّا تو دوہری خطا کار ہوتیں فریب خوردگی کی بھی اور فریب دہی کی بھی۔ حضرت آدم کا جرم صرف فریب خوردگی ہوتا۔ پھر بھلا معافی مانگنے کی زیادہ ضرورت حوّا کو ہوتی یا آدم کو اور پھر بھلا اللہ یوں کیوں کہتا کہ آدم نے

نافرمانی کی۔

سیّد صاحب کے دماغ پر کم سے کم اس وقت اسرائیلیات کا افسوں اس قدر طاری ہے کہ قرآن انھیں نظر نہیں آرہا ہے چنانچہ وہ مولانا آزادؒ پر طنز کرتے ہیں کہ ان لوگوں کا عجیب حال ہے جہاں ضرورت دیکھتے ہیں صرف قرآن کا حوالہ پیش کر دیتے ہیں احادیث یا آثار صحابہؓ و سلف کو نہیں دیکھتے حالانکہ مولانا آزادؒ تو اہل حدیث تھے پھر بھی ... (ص۱۲۸ ملخصاً)

ہم کہتے ہیں کہ اول تو مولانا آزاد اتنے کم فہم نہیں تھے کہ حدیثِ صحیح اور اسرائیلی روایات میں تمیز نہ کر سکتے ہوں۔ ان کے کسی ذاتی خیال سے اختلاف جائز لیکن ان کے علمی تبحّر اور بالغ نظری سے انکار تو مسلّمات کا انکار ہوگا۔ دوسرے یہ خبر کا معاملہ ہے انشا کا نہیں۔ احکام کے معاملے میں بے شک یہ ضروری ہے کہ قرآن کے ساتھ حدیث پر بھی نظر رکھی جائے۔ قرآن ایک حکم اجمالاً دیتا ہے حدیث اسکی تفصیل بتاتی ہے۔ قرآن ایک حکم مطلقاً دیتا ہے حدیث اس کی تحدید کرتی ہے۔ حدیث سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں حکم منسوخ ہو گیا یا باقی ہے وغیر ذلک۔ مگر کیا قرآن کی دی ہوئی کسی واضح خبر پر یقین کرنے کیلئے بھی حدیث کا دیکھنا ضروری ہے۔ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ ایک واقعہ بیان کرے اور ہم اسے اس وقت تک نہ مانیں جب تک حدیث نہ دیکھ لیں۔ اگر خدانخواستہ سید صاحب ایسا ہی سمجھتے ہیں تو انھیں اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہیئے۔

پھر عورتوں کو مرد کے مقابلے میں زیادہ گنہگار، کم رتبہ اور گھٹیا ثابت کرنے کے لئے سیّد صاحب نے جن روایات کا سہارا لیا ہے ان میں سے بعض بے اصل اور ناقابلِ اعتبار نہ بھی ہوں تب بھی ان کا مطلب وہ ہے ہی نہیں جو سیّد صاحب زبردستی نکال رہے ہیں۔ تعجب ہے کہ مولانا آزادؒ اور مولانا مودودی وغیرہ کی تنقیص و تخفیف کے جوش میں وہ علم و فہم کے تقاضوں سے بالکل ہی لاپروا ہو گئے ہیں۔

تفسیر ابن کثیر ہمارے سامنے کھلی ہے۔ خود سیّد صاحب بھی اسے کھولے بیٹھے ہیں۔ حافظ ابن کثیر روایات کے معاملے میں اگرچہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ جیسے محتاط نہیں اور کمزور روایات سے بھی کہیں کہیں کام لے ہی جاتے ہیں لیکن اس مسئلے میں انھوں نے بھی سورۂ بقرہ کی تفسیر کرتے ہوئے کہہ ہی ڈالا کہ یہاں بہتیرے مفسرین نے جو بہت سے قصّے بیان کئے ہیں وہ سب اسرائیلیات کے قبیل سے ہیں۔

اب آیئے ایک عبرت ناک نمونہ سیّد صاحب کے استدلال بالرّوایت اور حسنِ فہم کا تفصیلاً ملاحظہ فرمایئے۔ وہ تفہیم کی عبارت پر وہ ریمارک دینے کے بعد جسے ابھی آپ پڑھ چکے، یوں لکھتے ہیں:۔

> "معلوم نہیں علامہ مودودی بدءِ الحیض والی اس حدیث کے لئے کیا توجیہہ کریں گے جسکو حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ص۲۷۵ میں حضرت ابن مسعودؓ و حضرت عائشہؓ سے بسندِ صحیح نقل کیا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں بھی مردوں کے ساتھ مساجد میں نماز باجماعت کے لئے جایا کرتی تھیں۔ عورتوں نے یہ کیا کہ نماز کے وقت میں مردوں کی طرف تاک جھانک لگانی شروع کر دی جس کی سزا میں ان پر اللہ تعالیٰ نے حیض کی عادت مسلّط کر دی اور مساجد کی حاضری سے روک دیا گیا کیا اس حدیثِ صحیح سے بھی عورتوں کی اخلاقی گراوٹ ثابت نہیں ہوتی اور کیا اس سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ بیشتر انبیاء علیہم السلام کو عورتوں کی طرف سے ابتلا پیش آئے ہیں اور ان کے قصّے قرآنِ مجید اور احادیثِ صحاح و سیر سے ثابت ہیں"... (ص۱۲۸)

اس سے درج ذیل امور ظاہر ہوئے:۔

(۱) سیّد صاحب کے نزدیک حدیثِ صحیح سے یہ بات ثابت ہے کہ حیض کی عادت کوئی ایسی جبلّت اور فطرت نہیں،

جو شروع زمانے سے عورتوں میں موجود رہی ہو بلکہ بنی اسرائیل کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے بطور سزا اسے نافذ فرمایا۔

(۲) سید صاحب کی دانست میں حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک بھی یہی بات صحیح ہے اور اس کی صحت پر ابن حجرؒ نے بقول سید صاحب حدیثِ صحیح سے استدلال کیا ہے۔

(۳) سید صاحب کے خیال میں اس حدیث سے عورتوں کی ایسی اخلاقی گراوٹ کا پتہ چلتا ہے جس کے باعث ان کو عزّ و شرف کا وہ مقام نہیں دیا جاسکتا جو مردوں کو حاصل ہے۔

ہر شخص کئی کئی بار سید صاحب کی عبارت پڑھ کر ایمانداری سے بتائے کیا یہ تینوں امور صراحتہً اس میں نہیں پائے جارہے ہیں۔

(۴) ایک چوتھی چیز اس میں یہ بھی پائی جارہی ہے کہ عام قارئین حدیث کا مطلب "قولِ رسول" ہی سمجھیں گے نہ کہ قولِ صحابیؓ حالانکہ یہ غلط ہے۔ یہاں وہ جس بات کو حدیث کہہ رہے ہیں وہ قولِ صحابی ہے نہ قولِ رسولؐ۔

اب نگاہِ حیرت سے دیکھئے کہ حقیقی صورتِ حال کیا ہے اور سید صاحب نے کیسے عجیب علم و دانش کا مظاہرہ کیا ہے۔

سب سے پہلے وہی بخاری اٹھائیے جس کی شرح سید صاحب لکھ رہے ہیں۔ جلد اول کتاب الحیض کے پہلے ہی باب کا عنوان ہے **کیف کان بدء الحیض**۔ اس میں امام بخاریؒ فرماتے ہیں:۔

قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم هذا شیء کتبه اللہ علی بنات آدم وقال بعضهم کان اول ما ارسل الحیض علی بنی اسرائیل قال ابو عبد اللہ وحدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اکثر

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ حیض وہ چیز ہے جسے اللہ نے آدم کی تمام بیٹیوں کیلئے مقدر فرمایا ہے اور بعض سلف نے کہا کہ حیض سب سے پہلے بنی اسرائیل پر بھیجا گیا۔ ابو عبد اللہ (یعنی خود امام بخاری) کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا ارشاد تو ساری ہی عورتوں کو شامل ہے

اندازہ کیجئے۔ اللہ کے رسولؐ نے کتنے صاف لفظوں میں بیان فرمایا کہ حیض ایک ایسی شے ہے جو دنیا کی تمام عورتوں کا مقدر ہے۔ یہ نہیں کہ بنی اسرائیل سے قبل جو اربوں کھربوں عورتیں پیدا ہو چکی تھیں انھیں حیض نہیں آتا تھا۔ اگر انھیں حیض نہ آتا تو نسلِ انسانی آگے کیسے چلتی کیونکہ حیض اس عضویاتی عمل کا لازمی حصّہ ہے جو رحم میں استقرارِ حمل کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ حیض کے بغیر حمل کہاں۔ ویسے بھی انسانوں میں تمام ہی جبلتیں اور فطری داعیات آدم و حوّا ہی کے زمانے سے موجود ہیں۔ بھوک، پیاس، جنسی خواہش، محبت و نفرت، خوف و طیش، غم و راحت کے احساسات کونسی چیز ہے جو بعد میں تخلیق کی گئی ہو۔ یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ حیض جیسی جبلی اور طبعی اور فطری شئے بنی اسرائیل کی عورتوں سے شروع ہوئی ہو اور پہلے معدوم ہو۔ موٹی سی بات ہے کہ مرد اور عورت کے اُس حصۂ جسم کی ساخت ہی الگ الگ ہے جس کا تعلق توالد و تناسل سے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مشینری تو دونوں کی بالکل ایک ہی ہو اور بس عورت کو اس لئے حیض آتا ہو کہ اس پر عذاب مسلط ہے۔ عورت کی جسمانی مشینری میں دودھ بنانے، حمل کو سنبھالنے اور نشو و نما دینے اور حیض و نفاس کا لہو جاری کرنے کے لئے مرد سے مختلف کل پرزے ہیں اور یہ سارے کل پرزے پہلی خاتون حوّا میں موجود تھے جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔

مزید یہ کہ اسلام اس تصور سے قطعاً بری الذمہ ہے کہ کسی ایک نسل کی غلط کاری کا عذاب اگلی نسلوں کی طرف بھی منتقل ہو۔ اگر حیض کو اس روایت کے مطابق بنی اسرائیل کی عورتوں کے جرم نظر بازی کی سزا مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کے بعد سے قیامت تک تمام حوّا کی بیٹیاں سزا ہی بھگت رہی ہیں۔ اس قسم کا واہی تصور کسی اور قوم میں ہو تو ہو، اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

افسوس ہے اسی طرح کی روایتیں معقولیت پسند لوگوں کو علم الحدیث کی طرف سے بدگمان کرتی ہیں اور ان کا اعتماد

یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔

امام بخاریؒ نے جو کچھ کہا اس پر بھی غور کیجئے۔ اوّل تو ان کے الفاظ نے یہی وضاحت کردی کہ بنی اسرائیلؑ والی روایت قولِ رسولؐ نہیں ہے بلکہ امّتیوں میں سے بعض کا قول ہے۔ اور پھر اس قول کی تردید انھوں نے یہ کہکر کردی کہ رسول اللہؐ کا ارشادِ گرامی تو اس محدود قول کے برخلاف بہت وسیع ہے جو تمام عورتوں کو شامل ہے۔

لفظ "اکثر" کی تشریح بعض مستند شارحین مثلاً علامہ عینیؒ نے یہ کی ہے کہ غیر نبیؐ کے مقابلے میں نبیؐ کا ارشاد زیادہ قوی اور زیادہ لائقِ قبول ہے۔

کرمانی کے بیان کے مطابق بخاری کے بعض نسخوں میں بجائے "اکثر" کے اکبر کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ اعظم اور اجلّ اور اکدّ۔ یعنی امام بخاریؒ یہ فرما رہے ہیں کہ بعض صحابہؓ کے قول کے مقابلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث زیادہ عظیم الشان اور جلیل القدر اور بہ اعتبارِ ثبوت قوی و مؤکد ہے

(بخاری، جلد اوّل، صہ۴۳ علی الہامش)

یہ تو ہوئی بخاری شریف۔ اب حافظ ابن حجرؒ کی اس شرح کی طرف آیئے جس کا حوالہ دے کر سیّد صاحب مولٰنا مودودی سے توجیہہ پوچھ رہے ہیں۔ جرأت کی حد ہے کہ اسی فتح الباری میں اسی جگہ ابن حجر نے جو کچھ کہا ہے اسے سیّد صاحب نہیں پڑھ پا رہے ہیں۔ دیکھئے جلد اوّل صہ۲۷۶۔ یعنی موصوف نے جس صفحہ کا حوالہ دیا تھا اس سے اگلا ہی صفحہ۔ ابن حجر وہی بنی اسرائیل والی روایت حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کے حوالے سے نقل کر کے اپنی رائے ظاہر فرماتے ہیں:۔

قلتُ ـــ ویمکن ان یجمع	میں کہتا ہوں تمام ہی عورتوں کے لئے
بینھما مع القول بالتعمیم	حیض کو نوشتۂ قسمت ماننے کے باوجود
بان الّذی ارسل علیٰ نساء	بنی اسرائیل والی روایت کی یہ
بنی اسرائیل طول مکثہ	تاویل ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی
بھن عقوبةً لھم لا ابتداءً	عورتوں کی مدّتِ حیض اللہ نے بطور

گویا یہ ابن حجر بھی نہیں مانتے کہ حیض کا آغاز بنی اسرائیل کی عورتوں سے ہوا۔ پھر آگے وہ کہتے ہیں:۔

وقد روی الطبری وغیرہٗ	طبری وغیرہ نے صحابیِ رسولؐ
عن ابن عباس وغیرہ ان	ابن عباسؓ وغیرہ سے روایت کیا
قولہ تعالیٰ فی قصة ابراھیم	ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں
وَامْرَاَتُہٗ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ	اللہ جو قرآن میں یہ فرمایا کہ
ای حاضت والقصّة	وَامْرَاَتُہٗ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ[1]
متقدمة علیٰ بنی اسرائیل	اس میں ضَحِكَتْ سے مراد یہ ہے
بلا ریب وروی الحاکم وابن	کہ ان صاحبہ کو حیض آیا۔ اور یہ قصہ
المنذر باسناد صحیح عن	بلاشبہ بنی اسرائیل سے پہلے کا ہے۔
ابن عباس ان ابتداء الحیض	اور محدث حاکم اور ابن منذر نے
کان علیٰ حوّاء بعد ان	صحیح سندوں کے ساتھ ابن عباسؓ سے
اھبطت من الجنة واذا	نقل کیا ہے کہ حیض کا آغاز حوّاؑ سے
کان ذالك فبنات آدم	اسوقت ہوا تھا جب وہ جنت سے
بناتھا۔	نکالدی گئیں تھیں۔
❖ ❖ ❖ ❖	اور جب ایسا ہے تو ظاہر ہے کہ آدمؑ
❖ ❖ ❖ ❖	کی بیٹیاں تو حوّا ہی کی بیٹیاں ہیں۔

دیکھ رہے ہیں آپ۔ نہ تو بنی اسرائیل والی روایت اس معنی میں حدیث ہے کہ وہ حضورؐ کا ارشاد ہو بلکہ دو صحابہ کا اپنا قول ہے اور نہ امام بخاریؒ اسے کوئی وقعت دینے کو تیار ہیں اور نہ حافظ ابن حجرؒ اسے بغیرِ تاویل کے تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ وہ حدیث کی متعدد کتابوں سے صحابیِ رسول ابن عباس کی دو روایتیں ایسی تلاش کر کے لاتے ہیں جن سے ثابت ہو جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں سے آغازِ حیض کی بات قطعاً غلط ہے۔

علامہ عینیؒ شارح بخاری جنھیں سیّد صاحب نہایت جلیل القدر مانتے ہیں ان کی بھی شرح دیکھ لیجئے۔ وہ اس تاویل سے تو متفق نہیں جو ابن حجر نے پیش کی مگر یہ بہر حال وہ بھی نہیں مانتے کہ حیض کا آغاز بنی اسرائیل سے ہوا ہو۔ وہ تاویل یہ کرتے ہیں کہ ممکن ہے اللہ نے بنی اسرائیل کی عورتوں کا حیض

[1] سورۂ ہود۔ آیت ۷۱۔

سزائً روک دیا ہوا اور پھر اسے جاری کیا ہو۔

وہ فیض الباری بھی دیکھ لیجئے جو حضرت انور شاہ کاشمیریؒ کے امالی کا گلدستہ ہے اور سید صاحب اپنی انوار الباری کو شاہ صاحب ہی کے افادات قرار دے رہے ہیں۔

جلد اوّل ص۳۷۵ پر فرمایا گیا

والبخاری لم یبال بھذا الحدیث واخذ من قولہ ھذا شیئٌ کتبہ اللّٰہ علیٰ نبات آدم انہ من الابتداء ولیس بدؤہ عن بنی اسرائیل	اور امام بخاریؒ نے بنی اسرائیل والی روایات کی کوئی پرواہ نہیں کی اور رسول اللہؐ کے ارشاد ھذا شیئٌ کتبہ اللّٰہ علیٰ بنات آدم سے یہ مطلب لیا کہ حیض تو شروع سے چلا آرہا ہے اس کا آغاز بنی اسرائیل سے نہیں ہوا

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل والی آیت کو رد نہ کرنے کی بس ایک ہی صورت ہے یہ کہ اس کی مراد یہ لی جائے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں پر بطور قہر و عذاب مدتِ حیض بڑھادی گئی ہو۔ ایسا نہیں کہ حیض کی ابتدا ہی ان سے ہوئی ہو۔

ان تفصیلات کی روشنی میں فیصلہ کیجئے کہ سید صاحب کے تمام دعوے کہاں گئے۔ ہم کہتے ہیں بنی اسرائیل والی روایت کی سند اگر صحیح بھی ہو تو کیا سید صاحب اس قاعدۂ فن سے واقف نہیں ہیں کہ سند کی صحت متن کی سند کو مستلزم نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ ہم مان ہی لیں کہ واقعی حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی طرف اس متن کی نسبت درست ہی ہے تو اس کا حاصل اس سے زیادہ کیا نکلے گا کہ یہ دو صحابی کا قول ہے۔ ظاہر ہے انھوں نے اللہ کے رسولؐ سے تو اسے سنا نہیں ورنہ اس کا اظہار فرماتے۔ اِدھر اُدھر سے سُن لیا ہے اور معلوم ہے کہ اسرائیلی روایات بہت کافی پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر کیا مانع ہے یہ تسلیم کرنے میں کہ انھوں نے ایک غلط روایت پر اعتبار کرکے اسے دہرا دیا۔

اگر آپ یہ تسلیم نہیں کرتے بلکہ اصرار کرتے ہیں کہ یہ دونوں بزرگ صحابی غلط بات نہیں دہرا سکتے تو پھر ٹھیک ہے یوں کہہ دیجئے کہ رسول اللہؐ نے غلط فرمایا (خاکش بدہن) یہ تو بہرحال آپ کو ماننا پڑے گا کہ دونوں باتیں درست نہیں ہو سکتیں۔ حیض یا تو زمانۂ حوّا سے موجود ہے یا بنی اسرائیل سے شروع ہوا۔ پہلی بات آقاؐ بتا رہے ہیں۔ دوسری بات ایک صحابیہ اور ایک صحابی بتا رہے ہیں۔ آپ دونوں کو صحیح نہیں مان سکتے۔ ایک کو مانئے دوسری کو جھٹلائیے۔ ایمان کا تقاضا اگر یہی ہے کہ صحابہؓ کی بات مت جھٹلاؤ چاہے رسول اللہؐ کی تکذیب ہو جائے تو یہ ایمان آپ کو مبارک۔ ہم اس سے برئیت کا اعلان کرتے ہیں۔

ہو سکتا ہے سید صاحب جواب یہ دیں کہ آغازِ حیض کو تو میں بھی شروعِ عالم سے مانتا ہوں اور یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی ابتدا بنی اسرائیل سے ہوئی ہو لیکن روایت میں نے یہ دکھلانے کے لئے نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتیں مسجد میں تاک جھانک کرتی تھیں۔

ہم جواب دیں گے کہ اوّل تو آپ کا فرض تھا کہ ایسا کوئی فقرہ اس جگہ لکھ دیں جس سے آپ کا خیال واضح ہو جائے۔ بصورتِ موجودہ ہر قاری یہ سمجھنے پر مجبور ہے کہ آپ اپنی منقولہ روایت کے مطابق حیض کا آغاز بنی اسرائیل سے مانتے ہیں آخر کوئی شخص کیسے یہ تصور کر سکتا ہے کہ جس روایت کو آپ بڑے طمطراق سے "سندِ صحیح" کی وضاحت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں اس کا ایک جز تو آپ کے نزدیک جوں کا توں درست ہے اور ایک جز درست نہیں ہے بلکہ اس کی کوئی تاویل آپ نے ذہن میں بٹھا رکھی ہے۔

دوسرے یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ ایک ایسی روایت کو جو قولِ رسولؐ کی تکذیب اور قانونِ فطرت کا استہزا کر رہی ہو رد تو کیجئے نہیں بلکہ خواہ مخواہ کی تاویلیں گھڑ لیجئے اور پھر اس کے ایک جزو کو بطور حجت لائیے۔ حضرت انور شاہ صاحبؒ حافظ ابن حجرؒ، علامہ عینیؒ وغیرہ بلاشبہ اساطین میں ہیں لیکن جن تاویلوں کا وہ امکان نکالتے ہیں کیا ان کے

لئے کوئی ایک لفظ کوئی ہلکا سا اشارہ بھی روایت میں موجود ہے ـــــ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یہ تاویلیں ان کی اپنی اختراع ہیں۔ انکی حیثیت توجیہُ القولِ بِمَالَا یَرضٰی بہ القائل سے زیادہ نہیں۔ یہ حجت ہرگز کسی کے لئے نہیں۔

اس سلسلے میں عجیب عجیب روایتیں بعض ایسے بزرگوں نے جمع فرما رکھی ہیں جو اگرچہ بہت بڑے عالم تھے مگر روایات کے قبول میں محتاط نہیں تھے۔ مثلاً یہ روایت کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے لکڑی کے اونچے اونچے پائدان بنوا لئے تھے۔ نماز میں ان پر کھڑے ہوکر وہ اگلی صف کے ان مردوں کو گھورا کرتی تھیں جن سے ان کی آشنائی ہوتی تھی یا جن سے وہ آشنائی پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ خیر سے یہ روایت بھی عبداللہ ابن مسعودؓ کی طرف منسوب کردی گئی ہے۔ سوال کیا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے مرد آخر اتنے رشیہ خطمی کیوں بن گئے تھے کہ عورتیں باقاعدہ بڑھیوں سے پائدان یا ڈبے وغیرہ بنوا بنوا کر مسجدوں میں لارہی ہیں۔ ان پر چڑھ چڑھ کر دوران نماز میں اُچک رہی ہیں تاک جھانک کررہی ہیں مگر دو چانٹے رسید نہیں کرتے کہ یہ کیا ہورہا ہے۔

اگر یہ روایت صحیح ہو تو تصور وار پھر بھی مرد ہی ثابت ہوئے۔ مردوں کو اللہ نے خلقتہً طاقت ور بنایا ہے۔ فہم وشعور بھی زیادہ دیا ہے۔ عورتوں کی سربراہی اور بالادستی بھی فطرتاً انھیں حاصل ہے۔ وہ اگر مغفل بنکر عورتوں کو غیر ضروری ڈھیل نہ دیتے ہوتے تو عورتوں کی کیا مجال تھی کہ باقاعدہ بڑھیوں سے اونچے اونچے پائیدان بنواتیں پھر انھیں ہر نماز میں ساتھ لاتیں اور ان پر کھڑے ہوکر تماش بینی کرتیں۔ مردوں کی لٹیا ڈوب گئی تب عورتیں اتنی ڈھیٹ اور آزاد بن سکیں۔ کوئی کچھ کہے ہم تو کہیں گے کہ مولانا آزاد کی یہ عبارت آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:۔

"فی الحقیقت سب سے بڑا کید تو مرد ہی کا کید ہے
جو پہلے اسے (عورت کو) کا جوئیوں کا آلہ بناتا ہے
اور جب بن جاتی ہے تو خود پاک بنتا ہے اور ساری ناپاکیوں کا بوجھ اس معصوم کے سر ڈالدیتا ہے۔ دنیا میں کوئی عورت بُری نہ ہوتی اگر مرد اسے برا بننے پر مجبور نہ کرتا۔ عورت کی برائی کتنی ہی سخت اور مکروہ صورت میں نمایاں ہوتی ہو لیکن اگر جستجو کروگے تو تہ میں ہمیشہ مرد ہی کا ہاتھ دکھائی دے گا اور اگر اس کا ہاتھ نظر نہ آئے تو ان برائیوں کا ہاتھ ضرور نظر آئے گا کسی نہ کسی شکل میں اس کی پیدا کی ہوئی ہیں"۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ صفحہ ۲۹۸)

غالباً اسی لئے شجر ممنوعہ کھانے کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نشانۂ ملامت حوّا کو نہیں آدم کو بناتا ہے۔ کھانے کا جرم دونوں نے کیا شیطان کے بہکائے میں دونوں آئے لیکن وہ آیات آپ کے سامنے ہیں جن میں نافرمانی اور غفلت کا الزام اللہ تعالیٰ تنہا آدم ہی پر عائد کررہا ہے۔ سزا حوّا کو بھی دی گئی کہ بہرحال ارتکاب جرم ان سے بھی ہوا تھا لیکن بڑے اور اصل مجرم آدمؑ تھے۔ اللہ نے ان کو ہی توبہ واستغفار کے کلمات کا الہام کیا (فَتَلَقّٰی آدَمُ مِن رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیہِ۔ بقرہ) حوّا کو نہیں کیا۔ حوا کا جرم ضمنی اور تبعی تھا۔ آدمؑ کو معافی ملی تو انھیں بھی ملی۔ وہ برابر کی مجرم ہوتیں تو استغفار کے کلمات اللہ ان پر بھی القا کرتا۔

پھر چلئے ہم یہ بھی مانے لیتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی عورتیں اچھی خاصی آوارہ ہوگئی تھیں اور تمام روایتیں درست ہی ہیں لیکن محترم سید صاحب غور فرمائیں آوارگی قوم لوط کی "آوارگی" سے تو بازی نہیں لے گئی۔ قوم لوط نے اغلام بازی کی۔ غیر فطری گناہ جو بدترین گناہ ہونے کے علاوہ طبع سلیم کے بھی منافی تھا۔ کیا سید صاحب انصاف فرمائیں گے کہ اگر عورتوں کی محض تماش بینی اور نظر بازی اور تاک جھانک انھیں "اخلاقی گراوٹ" کا خصوصی مجرم بناسکتی ہے تو قوم لوط کے مردوں کی اخلاقی

گراوٹ کا پارہ کہاں تک نیچے پہنچا۔؟

اللہ کے بندو۔ مردوں کی ہوسناکیوں اور بدکاریوں اور شقاوتوں کی داستانوں سے تو حال و ماضی کی تاریخ لبالب ہے اور قرآن ہی کتنی ہی قوموں پر عذاب الٰہی کی خبریں سناتا ہے جن کے مردوں نے زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیا۔ بکری بیچاری جنگل میں کیا فساد پھیلا سکتی ہے اگر بھیڑئیے ہی اس کی پشت پناہی اور ہمت افزائی نہ کریں۔ عورت میں وہ بل بوتا تو ہے ہی نہیں کہ مردوں کے ایما اور اذن اور اعانت کے بغیر کوئی بڑا انقلاب لا سکے۔ کوئی بڑا فتنہ کھڑا کر سکے۔ جن واقعات میں آپ عورت کو فسادِ عظیم کا باعث دیکھتے ہیں ان کا بھی حقیقت پسندانہ تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ عورت کی حیثیت محض چارے کی ہے جسے چالاک مرد مچھلیاں پکڑنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ مصر وغیرہ نے جن یہودی عورتوں سے فریب کھا کر اپنا بیڑا غرق کیا سیّد صاحب کیا نہیں جانتے کہ یہ عورتیں اسرائیلی فنکاروں ہی کی کٹھ پتلیاں تھیں۔ مرد ہی انھیں تربیت دے کر اور سکھا پڑھا کر عرب ملکوں میں روانہ کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ اور پھر جن مسلمانوں نے ان سے فریب کھایا بڑے قصور وار تو وہ ہیں۔ عورت کو اللہ نے بے حد پُرکشش بنایا ہے حسن دیا ہے۔ ادائیں دی ہیں۔ کیا اسمیں عورت کا قصور ہے؟ مرد اگر فرطِ نفسانیت میں اندھے بنجائیں اور نہ دیکھیں کہ حسین عورت سے پینگیں بڑھا رہے ہیں وہ کون ہے کیا ہے تو بڑا مجرم کون ہوا؟

بے شک بعض انبیاء کو عورتوں کی طرف سے ابتلا پیش آیا ہے۔ بے شک بہت سی عورتیں آوارہ مزاج ہوتی ہیں۔ بے شک بنی اسرائیل کی عورتوں کا عیاشی پر مائل ہو جانا ممکن ہوسکتا ہے لیکن کیا بے شمار مردوں کی طرف سے انبیاء کو ابتلاء پیش نہیں آیا؟ کیا وہ مرد ہی نہیں تھے جنھوں نے بعض انبیاء کو آروں سے چیرا اور نیزوں سے قتل کیا۔ کیا وہ مرد ہی نہیں تھے جنھوں نے سب سے بڑے پیغمبرؐ کے پتھر مارے، لہولہان کر دیا۔ کیا آپؐ کے دانت شہید کرنے والی عورتیں تھیں؟

نیک بختو کچھ تو انصاف کرو۔ اگر صرف جنسی بے راہ روی یہ معنی رکھتی ہے کہ اس سے کسی جنس کے خلقی اور طبعی فضل و شرف میں بٹہ لگ گیا تو پھر مردوں کے حصے میں فضل و شرف کا کونسا حبہ باقی رہے گا جب کہ عورت کے مقابلے میں ان کی جنسی بے راہ روی کروڑوں گنا بڑھ کر ہے۔ فضل و شرف کا یہ معیار تو مردوں کو عورتوں سے کہیں ارذل اور پست بنا دیتا ہے۔

اور سید صاحب۔ ہم نے چلئے یہ بھی مان لیا کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو تاک جھانک کی پاداش میں حیض کی سزا دی گئی۔ لیکن کیا قوم لوط سزا کو نہیں پہنچی۔ کیا متعدد اور قومیں مردوں کی بداعمالیوں کی بنا پر معذّب نہیں ہوئیں۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ فقط ایک واقعہ کی بنا پر آپ عورت ذات کو تو مستقلاً مرد سے گھٹیا اور اخلاقی گراوٹ کا منبع قرار دے رہے ہیں جب کہ حیض والی سزا کوئی بہت بڑی اور بھیانک سزا بھی نہیں کہی جا سکتی مگر بے شمار سخت سے سخت واقعات کے باوجود مرد ذات کو آپ برتر اور اخلاق کا مجسمہ اور عورت سے اشرف منوانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کے جرائم اغلام بازی اور قتل و غارت اور شرک جیسے ہولناک جرائم تھے اور عذاب بھی ان پر تحس نہس کرنے والے نازل کئے گئے۔ کبھی بندر بنایا گیا۔ کبھی ہلاک کر دیا گیا۔

عقل دنگ ہے کہ یہ کیسا انصاف اور کیسی معقولیت ہے!

قرآن میں آیا ہے اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ۔ نساء، آیت ۳۴ (مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انھوں نے اپنے مال۔ ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس آیت کی تفسیر میں تفہیم القرآن میں یہ لکھا گیا:-

"یہاں فضیلت بمعنی شرف اور کرامت اور عزت نہیں ہے جیسا کہ ایک عام اُردو خواں آدمی اس لفظ کا مطلب لے گا بلکہ یہاں یہ لفظ اس معنی میں ہے کہ ان میں سے ایک صنف (یعنی مرد) کو اللہ نے طبعاً بعض ایسی خصوصیات اور قوتیں عطا کی ہیں جو دوسری صنف (یعنی عورت) کو نہیں دیں یا اس سے کم دی ہیں۔ اس بنا پر خاندانی نظام میں مرد ہی قوّام ہونے کی اہلیت رکھتا ہے اور عورت فطرۃً ایسی بنائی گئی ہے کہ اسے خاندانی زندگی میں مرد کی حفاظت و خبرگیری کے تحت رہنا چاہئیے۔" (جلد ۱ صفحہ ۳۴۹)

یہ بھی سمجھ لیجئے کہ مولانا آزادؒ یا مولانا مودودی جو اس طرح کی تنبیہات کر رہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم قوموں میں پہلے بھی ایسے نام نہاد مفکر رہے ہیں اور آج بھی ہیں جو عورت کو خِلقۃً ذلیل اور گھٹیا جنس تصور کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے عورت برائی کی جڑ اور فتنہ و شر کی ماں ہے۔ کوئی کہتا ہے تمام مصائب کا سرچشمہ عورت ہی ہے۔ کوئی کہتا ہے وہ ملعون ہے۔ وغیر ذلک۔

یہ دونوں بزرگ ان بیہودہ افکار کا قلع قمع کر کے صحیح اسلامی تصور پیش کرنا چاہتے ہیں اور مسلمانوں کو اس خطرے سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ کسی آیت کا مفہوم ایسا نہ سمجھ لیں جو ان واہی افکار سے مطابقت رکھتا ہو۔

بس یہ ہے قصور ان دونوں کا۔ اب سیّد صاحب کی خوش کلامی سنیئے:-

> "بڑی حیرت ہے کہ مولانا آزادؒ اور علامہ مودودی نے آیتِ قرآنی الرّجال قوّامون علی النساء کی تفسیر میں بھی ایسا طریقہ اختیار کیا ہے جس سے ان کے مزعومہ نظریۂ مساواتِ مرد و زن پر کوئی زد نہ پڑ سکے اور وہ مردوں کے لئے عورتوں پر حاکمیت و افضلیت کا مرتبہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔" (صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱)

ہمیں اس موقع پر بے اختیار وہ بریلوی فن کار یاد آئے جو کسی ایسے موقع پر جب کہ ہم جیسا کوئی دیوبندی یہ کہہ رہا ہو کہ رسول اللہ ﷺ یقیناً بشر تھے اور عالم الغیب نہیں تھے اور اولیاء اللہ کائنات میں متصرف نہیں ہیں اور قبروں پر سجدہ حرام ہے۔ فوراً یہ چیخ پڑتے ہیں کہ دیکھو وہابی کیا بک رہا ہے۔ وہابی! ـــــ ایک ننھا سا لفظ۔ مگر بڑے بڑے دفتروں پر بھاری۔ اسی طرح سیّد صاحب "مساواتِ مرد و زن" کی بدنام ترین اصطلاح استعمال کر کے مولانا آزادؒ اور مولانا مودودی کو کنوئیں سے کاٹ دینا چاہتے ہیں۔ کاش وہ یہ بھی نشاندہی فرما دیتے کہ یہ نعرہ آخر انھوں نے کہاں سے کھودا۔ ہمیں تو ان دونوں کی تصانیف میں کہیں نظر آیا نہیں۔

افسوس اہلِ علم اور یہ اوچھے حربے!

قارئین! تفہیم کی منقولہ بالا عبارت پھر پڑھئے کیا اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مرد عورت پر قوّام اور حاکم نہیں ہیں۔ کیا اس میں یہ کہا گیا ہے کہ مرد کو عورت پر فضیلت ہے ہی نہیں؟ کیا اس میں ایسے کسی فکر کا ذرا سا شائبہ بھی موجود ہے جو "مساواتِ مرد و زن" کے مشہور نعرے سے جوڑ رکھتا ہو۔

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو کیا جان رہ جاتی ہے سیّد صاحب کے اعتراض میں۔ کتنا سنگین ہے یہ الزام کہ مولانا مودودی مرد کا وہ رتبہ نہیں مانتے جو قرآن منوانا چاہتا ہے۔ حالانکہ مودودی اس رتبے کو مان کر ہی یہ وضاحت کر رہا ہے کہ لفظ "فضیلت" سے مراد یہاں کیا ہے۔ پھر یہ بھی آپ نے آدم و حوا کی بحث میں تفہیم کے نوٹ سے سمجھ لیا کہ مولانا مودودی کے پیش نظر ان واہیات مفروضوں کی تردید ہے جو بعض غیر مسلموں نے عورت کے قانونی اخلاقی اور معاشرتی مرتبے کو گھٹانے کے لئے قائم کر رکھے تھے اور کر رہے ہیں۔ مولانا مودودی نہیں چاہتے کہ قرآن میں مرد کی فضیلت کا ذکر دیکھ کر کم علم اور کم فہم مسلمان اس نوع کی فضیلت تصور کر لیں جس نوع کی یہ مفروضے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ویسے بھی لفظ فضل قرآن میں کم سے کم ستر بار تو استعمال ہوا ہی ہے اور جملہ مقامات پر اس کا ایک ہی مفہوم نہیں ہے۔ کہیں اس سے اللہ کی رحمتِ عامہ مراد ہے کہیں رحمتِ خاصہ۔ کہیں اس کا مطلب مال و دولت ہے کہیں انسانوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں امتیاز لہٰذا ایک بیدار مغز مفسر کے لئے تو ضروری ہی تھا کہ جہاں جو مراد ہے اسے کھول کر بتادے۔ مثلاً ایک تو فضیلت وہ ہے جو جو اللہ نے تمام نوعِ انسانی کو باقی مخلوقاتِ ارضی پر دی۔ یہ نوعی فضیلت ہے یعنی انسان کا ہر فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد تمام حیوانات و نباتات و جمادات اور حشراتُ الارض سے افضل ہے۔ اس فضیلت کو اللہ نے سورۂ بنی اسرائیل میں بایں الفاظ بیان فرمایا۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (ہم نے اولادِ آدم کو فضیلت دی)

دوسری فضیلت وہ ہے جو بعض رسولوں کو بعض رسولوں پر ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ظاہر ہے کہ یہ فضیلت نوعی نہیں نوع کے اعتبار سے تو تمام رسول یکساں ہیں بلکہ وصفی ہے اور اس کا تعلق اوصافِ وہبیہ سے ہے یعنی وہ اوصاف جو خداداد ہیں کسبی نہیں ہیں۔ اس میں اور پہلی فضیلت میں جو فرق ہے محتاجِ بیان نہیں۔ اسی طرح وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ میں بھی وہی فضل مراد ہے جو خداداد ہو۔ جیسے حسنِ صورت۔ اعلیٰ ذہانت، ڈیل ڈول، جسمانی طاقت، حسب و نسب وغیرہ۔

تیسری فضیلت وہ ہے جو بعض انسانوں کو بعض انسانوں پر کسب و عمل کی وجہ سے ہے فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً (اللہ نے بیٹھ رہنے والوں کے مقابلے میں ان لوگوں کو ایک درجہ فضیلت عطا کی جو لڑے اللہ کی راہ میں جان و مال سے۔ النساء ۹۵) لڑنا اور مجاہدہ کرنا اعمال ہی کے قبیل سے ہے لہٰذا فضیلت کی یہ قسم پہلی دونوں قسموں سے الگ ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ حقیقت پسندانہ تجزیہ و تحلیل کے بعد ثابت ہو جاتا ہے کہ فضیلت قرآن میں کئی مفاہیم کیلئے آئی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہر مقام پر ایک ہی مصداق و مفہوم ہو۔

اور یہ کچھ اسی لفظ کے لئے خاص نہیں۔ بہتیرے الفاظ ہیں جو قرآن میں الگ الگ معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ لفظ کافر جہاں بے شمار جگہ مومن کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے "کسان" کے لئے بھی استعمال ہوا۔

ابھی آپ نے کرّمنا کا لفظ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔ (اور ہم نے عزت دی ہے آدمؑ کی اولاد کو اور سواری دی انکو جنگل اور دریا میں اور روزی دی ہم نے ان کو ستھری چیزوں سے اور بڑھا دیا ان کو بہتوں سے جن کو پیدا کیا ہم نے بڑائی دے کر۔ ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہاں کرّمنا میں جس فضیلت و شرف کا بیان ہے وہ وہ ہے جو ہر مرد اور عورت کو چاہے وہ صالح ہوں یا گناہگار خوبصورت ہوں یا بدصورت، فقیر ہوں یا امیر، کم عمر ہوں یا سن رسیدہ دوسری تمام مخلوقاتِ ارضی پر عطا کی گئی ہے جانور، سمندر، پہاڑ، درخت، کیڑے مکوڑے، سونے چاندی کی کانیں۔ کوئی نہیں جو شرف و فضیلت میں انسان کے ایک ننھے بچے یا بچی کی برابری کر سکے۔

لیکن یہی لفظ کرامت جب دوسری آیت میں استعمال ہوتا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ تو یہاں بالکل دوسری ہی نوع کی فضیلت و عزت مراد ہوتی ہے۔ خود قرآن نے سرکش کافروں کے بارے میں صاف فرمایا کہ وہ تو جانوروں سے بھی گئے گذرے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی بناء پر جو فضیلت و عزت حاصل ہوتی ہے وہ وہ نہیں جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔ یہاں ایک وفادار کتا اس ہٹے کٹے دولت مند انسان سے زیادہ افضل و اشرف ہے جو خدا کی نافرمانیوں

میں لگا ہوا ہو اور اسی حال میں مرجائے۔

رُشد کا لفظ متعدد آیات میں بمعنی ہدایت، بھلائی، حق استعمال ہوا جیسے قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ اور وَ اِنْ تَرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ مگر یہی لفظ سورۂ نساء میں بمعنی ہوشیاری استعمال ہوا فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ حتیٰ کہ فسق بھی اِس رُشد کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔

قرآن میں فرمایا گیا۔ اللہ کی مدد کرو۔ اللہ کو قرض دو۔ صاف ظاہر ہے ان مقامات پر قرض اور مدد کا وہ مطلب نہیں ہوسکتا جو دوسرے عام مقامات پر ہوتا ہے۔

پھر کیا قصور کیا ہے مولانا مودودی نے اگر الرّجال والی آیت کی تفسیر میں لفظِ فضیلت کا وہ صحیح مفہوم بیان کر دیا جو اس جگہ مراد ہے اور جس کے علاوہ کوئی مفہوم یہاں مراد ہو ہی نہیں سکتا۔ علامہ عثمانیؒ، مولانا اشرف علیؒ، علامہ آلوسیؒ، ابن جریرؒ، ابن کثیرؒ سبھی یہاں فضیلت سے مراد وہی فضیلت لیتے ہیں جس کی تفصیل ہم "دوسری فضیلت" کی حیثیت سے بیان کر آئے۔ یعنی بعض اوصافِ خداداد کی بنا پر برتری۔ اور کوئی مستند مفسر نہیں جس نے یہاں پہلی یا تیسری قسم کی فضیلت مراد لی ہو۔ یہی مولانا مودودی کر رہے ہیں۔ ان کی عبارت پھر پڑھئیے۔ وہ "مساواتِ مرد وزن" کا نعرہ نہیں مار رہے ہیں۔ اسے تو محاورے میں "کان بجنا" کہتے ہیں جس کا شکار سیّد صاحب ہوئے۔ یہ نعرہ لگانے والے تو صاف کہتے ہیں کہ کیسا قوّام اور کیسا بالادست۔ عورت مرد بالکل یکساں ہیں۔ ان کا ترکہ میں بھی یکساں حصّہ ہے۔ ان میں کوئی خادم و مخدوم نہیں وغیرہ۔ اس کے برعکس مولانا مودودی ثابت کر رہے ہیں کہ مرد کا قوّام اور محافظ اور بالادست ہونا تو عین قانونِ طبعی کے مطابق ہے اور عورت خِلقتہً پیدا ہی کی گئی ہے ایسی کہ مرد کی حفاظت اور خبرگیری کے تحت رہے۔ کیا اسی کے معنی ہیں "مساواتِ مرد وزن" اور کیا واقعی سیّد صاحب ہوش کے عالم میں تھے جب انھوں نے مودودی کے بارے میں یہ الفاظ لکھے کہ:۔

"وہ مردوں کے لئے عورتوں پر حاکمیت و افضلیت کا مرتبہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔"

مزید لطیفہ یہ کہ انھوں نے ایک حاشیہ بھی دیا جو یہ ہے

"اس پر حیرت نہ کیجئے کہ ایک عالم کس طرح ایسی بات لکھ سکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے فضیلت بول کر بھی فضیلت و شرف کا ارادہ نہیں کیا بلکہ ایسے معنی مراد لئے ہیں جن سے فضیلت کی نفی ہوسکتی ہے۔" (ص ۱۳۱)

اہلِ علم ہنسیں یا روئیں یہ حاشیہ بہرحال موجود ہے۔ ایک بار پھر تفہیم کا نوٹ پڑھئیے۔ کیا اس میں واقعی یہ کہا گیا ہے کہ "خدا تعالیٰ نے فضیلت بول کر بھی فضیلت و شرف کا ارادہ نہیں کیا۔"

ہم سمجھتے تھے کہ حضورؐ کی بشریت اور علم غیب وغیرہ کے سلسلے میں غالی قسم کے بریلوی حضرات جو علم کلام استعمال کرتے ہیں اس سے بڑھ کر واہی اور بوگس علم کلام دوسرا نہیں ہوسکتا مگر سیّد صاحب کے علم کلام نے ہماری خوش فہمی کا پردہ چاک کر دیا اور ہمیں دل پر پتھر رکھ کر ماننا پڑا کہ :۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

آگے وَ لِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ پر حاشیہ دیکر سیّد صاحب نوٹ لکھتے ہیں :۔

"اس پر کوئی وضاحتی نوٹ نہ مولانا آزادؒ نے اپنی تفسیر میں دیا نہ مولانا مودودی نے۔ دونوں خاموشی سے گذر گئے کہ "در گفتن نمی آید"۔" (ص ۱۳۲)

ہم بڑے دُکھ کے ساتھ سیّد صاحب سے عرض کریں گے کہ مولانا! بے شک آپ بہت بڑے عالم فاضل ہیں لیکن یہ دونوں بزرگ بھی بہرحال اتنے گئے گذرے تو نہیں ہیں کہ ان سے ٹھٹول کیا جائے اور ان کے حسنِ نیت پر بھی طعن ہو۔ آپ نے غالباً اپنے طنز کے مضمرات پر غور نہیں کیا۔ آپ کی دانست میں یہ دونوں حضرات قرآن و حدیث کے

خلاف "مساواتِ مرد وزن" کا فاسد نظریہ قائم کئے ہوئے ہیں اور جب تفسیر کے دوران مذکورہ آیت ان سے سامنے آئی تو دفعتاً وہ چونکے کہ اس سے تو ہمارے نظریہ کی تردید ہو گئی۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اپنے فاسد نظریہ سے سے دستبردار ہو جاتے پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس پر جمے رہے اور اس آیت پر تفسیری نوٹ بھی نہیں لکھا کہ اس سے ان کے نظریہ پر زد پڑتی تھی۔

یہی تو مطلب ہوا نا "در گفتن نمی آید" کا؟

مجمع الفضائل! خدا سے ڈریئے۔ علم و خرد کے زعم میں ایسے اساتذہ اور مشاہیر پر دانستہ حق پوشی کا الزام لگانا اور طنز و طعن کرنا اہلِ علم کو زیبا نہیں ہے۔ خدا اس پر پکڑ بھی کر سکتا ہے۔ اعتراضات شوق سے کیجئے مگر دائرۂ ادب میں رہ کر اور وقار و متانت کا لحاظ رکھ کر۔

لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کا ترجمہ مولانا مودودی نے یہ کیا ہے:۔

"البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔"

یہ ایک سادہ و صاف سا جملہ ہے جو بغیر کسی تفسیر کے بھی ہر شخص کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ دنیا میں ایسی کوئی تفسیر نہیں ہے جس میں قرآن کے ہر ہر فقرے پر لازماً تفسیری نوٹ دیا گیا ہو پھر اگر مولانا آزاد اور مولانا مودودی نے اس فقرے پر مستقل نوٹ نہیں دیا تو اسے بدنیتی اور کتمانِ حق کی ارادی کوشش قرار دینا کیا معنی؟

کیا یہ جملہ بجائے خود یہ ظاہر نہیں کر رہا ہے کہ مولانا مودودی نام نہاد "مساواتِ مرد وزن" کے قائل نہیں ہیں۔ مساوات کہاں رہی جب مردوں کے لئے ایک فاضل درجہ مان لیا گیا۔ سید صاحب غور فرمائیں تو اس پر وضاحتی نوٹ نہ دینا ہی بجائے خود اس بات کی خاموش شہادت ہے کہ مساواتِ مرد وزن کا کوئی تخیل مترجم کے ذہن میں نہیں۔ اگر ہوتا تو اس تخیل کو مسترد کرنے والا یہ فقرہ اسے ضرور کھٹکتا اور وہ ادبدا کر اس پر ایسا کوئی نوٹ لکھتا جس سے اس کے تخیل کی حمایت و حفاظت ہو سکتی۔ نہ لکھنا اور خاموشی سے گذر جانا نفسیاتی دلیل ہے مساوات کے تخیل و تصور سے بے تعلق ہونے کی۔

سید صاحب یہاں علامہ عثمانیؒ کے تفسیری فقرے نقل کرتے ہیں جن میں ایک فقرہ یہ ہے:۔

"کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور فوقیت ہے"۔

فضیلت اور فوقیت کے الفاظ کو نمایاں کر کے ان پر انھوں نے خط بھی کھینچ دیا ہے۔ گویا وہ قارئین کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ فضیلت کے قائل علامہ عثمانیؒ بھی ہیں مگر یہ آزادؒ اور مودودی قائل ہو کر نہیں دیتے۔

اس دلچسپ علمِ کلام پر ہمیں کسٹوڈین کا ایک مقدمہ یاد آیا جس میں زید کہہ رہا تھا کہ صاحب میں تو آپ کے سامنے زندہ کھڑا ہوں پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ زید کا انتقال ہو گیا۔ کسٹوڈین آفیسر فرما رہے تھے۔ کاغذات میں تمہارا انتقال درج ہے پھر ہم کیسے مان لیں کہ تم زندہ ہو۔

کثیر المناقب سید صاحب۔ کتنی بار عرض کیا جائے کہ مولانا مودودی فضیلت کا انکار نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

"مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔" (تفہیم جلد ۱ ص ۳۴۹)

کیا مولانا عثمانیؒ ہی کی طرح انھوں نے "فضیلت" کا اقرار نہیں کیا۔ اگر اس بدیہی اقرار کے بعد وہ تفسیری نوٹ میں یہ وضاحت کر دیتے ہیں کہ فضیلت سے یہاں کیا مراد ہے تو اس سے فضیلت کا انکار کیسے لازم آ گیا۔ سید صاحب اور دیگر حضرات علامہ عثمانیؒ کا وہ نوٹ پڑھیں جو انھوں نے اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (سورۂ نساء آیت ۳۴) پر دیا ہے (نوٹ نمبر ۶۴) اس میں "فضیلت" کا جو مطلب انھوں نے بتایا ہے ٹھیک وہی ہے جو مولانا مودودی نے منقولہ نوٹ میں بتایا۔ الفاظ کا فرق تو ہونا ہی تھا مگر معنی و مدعا میں مطلق فرق نہیں۔

عجیب و غریب

یہاں تک لکھ چکے تھے کہ معاً ہمیں خیال آیا — ذرا انوار الباری کی وہ جلد تو دیکھ لیں جس میں خود سید صاحب نے بخاری کی حدیث بدء الحیض کی شرح کی ہوگی۔ مکتبہ سے منگائی اور دیکھی ششدر رہ گئے کہ:-

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یعنی یہاں چونکہ آزادؔ اور مودودی کی کھال کھینچنے کا موڈ سید صاحب کو نہیں تھا اس لئے کم و بیش وہی سب کچھ لکھ گئے جو ہم پچھلے اوراق میں اس بحث میں لکھ آئے ہیں۔

یہاں وہ مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل والی روایت قولِ رسولؐ نہیں قولِ صحابی ہے۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ قولِ رسولؐ کے مطابق حیض آغازِ عالم ہی سے تمام عورتوں کو آرہا ہے۔ یہ بھی مانتے ہیں کہ ابن حجر اور عینی اور مولٰنا گنگوہی اور مولانا انور شاہ رحمہم اللہ سبھی کے نزدیک قولِ رسولؐ فیصلہ کن ہے اور بنی اسرائیل والی روایت کی تاویل کی جائے گی۔

اب کیا یہ کچھ کم حیرت کی بات ہے کہ مولانا آزادؔ اور مولانا مودودی پر اعتراض کرتے وقت انھوں نے اپنا ہی لکھا بھلا ڈالا اور وہ کچھ سپردِ قلم کیا جسے تمام کا تمام ہم نقل کر آئے ہیں۔ ایک بار پھر پلٹ کر پڑھ لیجئے تاکہ تضاد و تخالف کا احساس فرما سکیں۔

اور بدء الحیض کی بحث کے ذیل میں ایک اور بھی کافی دلچسپ چیز ملی ہے جس کا تذکرہ خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

اب ہمارے سامنے انوار الباری جلد ہشتم (قسط دہم) ہے۔ ایک حدیث آئی ہے جس میں حضورؐ نے حیض کو "نقص دین" فرمایا ہے۔ اسی حدیث کا ذکر مولانا گنگوہیؒ کے حوالے سے سید صاحب صفحہ ۱۱ پر کرتے ہیں۔ پھر تقریباً ایک صفحے تک وہ شد و مد کے ساتھ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اگرچہ حضورؐ نے حیض کو "نقص دین" فرمایا مگر یہ ظاہری و سطحی اعتبار سے ہے فی الحقیقت حیض کوئی نقص نہیں ہے اور عورتیں ناقصات الدین ہرگز نہیں ہیں۔ ان کے متعدد فرمودات ملاحظہ ہوں

(۱) حیض رحمت ہے۔ کیونکہ اس سے ارحام میں قبولِ حمل کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) حیض کی صحیح صورت عورت کے عضوِ رحم کیلئے صحت مندی کی دلیل ہے۔

(۳) عورتوں پر جو فرائض عائد ہیں ان کی ادائگی پر انھیں "کامل الدین" کہا جائے گا ناقصاتُ الدین نہیں خواہ وہ دوسروں کے لحاظ سے اعمال میں قاصر ہی رہی ہوں۔

(۴) حدیث کی رو سے وہ عورتیں جو شوہروں کی تابعداری اور خدمت کرتی ہیں۔ مجاہدین اور کامل الایمان مردوں کے برابر ہو جائیں گی۔

اسی جگہ سیّد صاحب نے یہ فقرہ بھی لکھا ـــ " تو دیکھا جائے کہ وہ دینی نقص کہاں گیا؟" اس فقرے کے تیور دیکھ لیجئے اور یہ ملحوظ رکھیئے کہ خود سیّد صاحب کی ذکر فرمودہ حدیث کے مطابق حیض کو "نقصِ دین" نبی کریمؐ نے کہا تھا کسی اور نے نہیں اور سیّد صاحب کے اس تعریضی فقرے کا روئے سخن حضورؐ ہی کی طرف ہے۔ کیا اب ہم بھی کہیں یا للّٰہ یاسف؟

(۵) جس امر کو نقصانِ دین اوپر کی حدیث میں کہا گیا ہے وہ ظاہری لحاظ سے کمی ضرور ہے مگر در حقیقت حالتِ عذر و مجبوری کی کمی و نقصِ اعمال کوئی نقص دینی نہیں ہے"

یہ ہیں سیّد صاحب کے کچھ فرمودات۔

اب ہم یہ نہیں کہتے کہ انھوں نے قولِ رسولؐ کی جو توجیہ کی وہ غلط ہے۔ ہم یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ یہی وہ بزرگ ہیں جو مولانا مودودی پر صرف اس لئے بگڑ رہے تھے کہ انھوں نے لفظِ "فضیلت" کی شرح کیوں کر دی۔ اس شرح سے انھوں نے بطور خود انکار فضیلت نکالا اور مودودی کی طرف یہ فقرہ منسوب کر دیا کہ ـــ "خدا نے فضیلت کا لفظ بول کر فضیلت کا ارادہ نہیں کیا"۔ حالانکہ ایسا فقرہ تفہیم میں موجود نہیں تھا۔

اب خود ان بزرگ کا کیا اسوہ ہے۔ "نقص" ہر حال میں

کمی اور خامی ہی کو کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کمال کے مقابلے میں بولا جاتا ہے۔ کسی لغت میں اس کے ایسے معنی نہیں مل سکتے جو "کمال" کے مرادف ہوں۔ پھر لفظ دین کی طرف اسکی اضافت ہوگئی تو یہ بھی بظاہر متعین ہوگیا کہ دین کی خامی اور کمی اور نامکمل پن مراد ہے۔ پھر یہ قول کس کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ سید صاحب کھل کر اور ڈٹ کر ثابت کر رہے ہیں کہ رسول اللہ نے نقصِ دین بول کر نقصِ دین کا ارادہ نہیں کیا۔ عورت حیض کی بنا پر ہرگز ناقص الدین نہیں۔ حیض ہرگز نقصِ دین نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

حدیثِ رسول ﷺ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسی دو بدو گفتگو اور ایسی صریح تردید اور ایسا دو ٹوک لب لہجہ! — مگر ملزم مولانا آزادؒ اور مولانا مودودی ہی ہے سید صاحب کی تہذیب و شائستگی اور حسنِ کلام اور صحتِ عقائد اور علم و فضل پر کوئی حرف نہیں آیا!

اے انصاف! اگر تو آسمان کے نیچے کہیں موجود ہے تو قریب آ اور سینہ پیٹ کر اربابِ فضل تجھ سے کس درجہ خفا اور بیزار ہیں!

سید صاحب کے مزید اعتراضات کا جائزہ انشاء اللہ دوسری صحبتوں میں لیا جائے گا آج کی مجلس ختم کرنے سے قبل ہم اجازت چاہیں گے کہ ایک اشکال ہم بھی پیش کردیں اشکال کا لفظ ہم نے اس لئے بولا کہ سید صاحب درجۂ استاد میں ہیں اور ہم ایک نالائق طالب علم۔ ہماری تو سندِ فضیلت بھی بکس میں رکھے رکھے "زنگ" کھا گئی ہے۔ ہمارا کیا رتبہ کہ سید صاحب پر معترض ہوسکیں۔ بس ایک طالبعلمانہ بلکہ شاگردانہ الجھن ہے جس کی گرہ کشائی ہم محترم سید صاحب سے چاہتے ہیں۔ تجلی کے صفحات حاضر ہیں۔ اگر ان کا ناخنِ علم و تحقیق الجھن کی گرہیں کھول سکے۔

ہمارا اشکال

پچھلے صفحات میں ہم تفصیل سے بتا آئے ہیں کہ آدم و حوّا کے شجرِ ممنوعہ کھانے کا واقعہ قرآن میں تین جگہ بیان ہوا ہے۔ ورق اُلٹ کر پھر سے دیکھ لیجئے۔ پہلے دو مقامات سے ظاہر ہے کہ شیطان نے دونوں کو بہکایا اور تیسرے مقام سے پتا چلتا ہے کہ شیطان کا اصل نشانہ حضرت آدمؑ تھے اور حوّا کی حیثیت ثانوی تھی۔ شیطان جانتا تھا کہ آدمؑ جھانسے میں آگئے تو حوّا تو خود بخود ان کے پیچھے چل نکلیں گی۔ چنانچہ اللہ جل شانہٗ کی توضیح کے مطابق شیطان براہِ راست آدم سے مخاطب ہوا — قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ....

اب اگر کوئی یہ کہے کہ شیطان حضرت آدمؑ سے مخاطب نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے حوّا کو بہکایا تھا اور حوّا نے آدم کو پٹی پڑھائی تھی تو کیا یہ صریح طور پر قرآن کو جھٹلانا نہیں ہوگا؟ سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے یکساں طور پر فرمایا ہے کہ فَأَزَلَّهُمَا اور فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ۔

ہم پوچھتے ہیں اگر زید عارفہ کو بہکائے اور عارفہ جاکر اپنے شوہر کو بہکائے تو کیا ہم اس صورتِ واقعہ کو کبھی اس انداز میں بھی بیان کرتے ہیں کہ زید نے عارفہ اور اس کے شوہر دونوں کو بہکایا؟ — کبھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو ہم کہتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ زید نے عارفہ کے ذریعہ اس کے شوہر کو بہکایا۔ گویا ذریعہ اور واسطے کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے یہ دونوں مقامات اس شہرت یافتہ روایت کی تردید میں بالکل کافی ہیں جو یہ بتاتی ہے کہ شیطان نے حوّا کو یا سانپ کو بہکایا پھر سانپ نے حوّا کو اور حوّا نے آدم کو۔ تاہم کوئی کھینچ تان کر کے ایسی وساطت کا امکان پیدا کر ہی لے تو سورۂ طٰہٰ والی آیت تو فوراً اس کی زبان پکڑے گی اور امکانِ وساطت کے مفروضہ کا دروازہ بند کردے گی۔ یہاں تو شیطان اور آدمؑ کا مکالمہ بیان ہورہا ہے۔ الگ بات ہے کہ شیطان اس وقت کسی نظر آنے والی شکل میں حضرت آدمؑ کے سامنے کھڑا تھا یا دور ہی سے وسوسہ اندازی کر رہا تھا۔ یہ بہرحال طے ہے کہ براہِ راست وہ آدم کو پٹی پڑھا رہا تھا۔

ایک محترم سید صاحب! آپ مولانا آزادؒ کے خیالات کا رد کرتے ہوئے جو تقریر انوار الباری جلد دہم (قسط دوازدہم) میں ص۱۲۸ سے ص۱۲۹ تک فرما رہے ہیں اس میں آپ نے بطور استدلال مرقات شرح مشکوٰۃ سے یہ روایت بھی نقل فرمائی ہے:-

"حضرت حوّا نے حضرت آدم علیہ السلام کو ترغیب دے دے کر شجر ممنوعہ کھانے پر آمادہ کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر کو غلط کام کیلئے آمادہ نہ کرتی۔"

ہم پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہے کہ مولانا شبلیؒ، مولانا آزادؒ اور مولانا مودودی کے سلسلے میں تو آپ کی ذکاوتِ احساس اور چوکنے پن کا یہ عالم ہے کہ بقول شاعر:-

فرشِ مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

ان بزرگوں کے بعض ارشادات کا تجزیہ آپ ایسی تیسیح کے انداز میں کرتے ہیں اور گیہوں کے انبار سے رائی کے چند دانے ڈھونڈ کر لاتے ہیں کہ دیکھئے ان لوگوں نے کیا چار سو بیس مچا رکھی ہے۔ گیہوں کے ڈھیر میں یہ دانے ملا رکھے ہیں۔

لیکن ملّا علی قاری کی مرقات میں ایک ایسی روایت دیکھ کر جو قرآن سے جدل اور منازعت اور ہاتھاپائی کر رہی ہے آپ کی ذکاوتِ حس اور قوتِ نقد و تجزیہ اور غیرتِ دینی اور حمیتِ حق کے جذبات میں کوئی ہیجان پیدا نہیں ہوتا۔ ملّا علی قاری سے ذرا نہیں کہتے کہ یہ آپ کیسی "قرآن دشمن" اور خدا کی تکذیب کرنے والی روایت پیش فرما رہے ہیں۔ اس کے برخلاف آپ تو اس روایت کو بطور دلیل و برہان اٹھا لائے ہیں اور آگے کچھ ایسے فقرے لکھ مارے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کی سورہ طٰہٰ کبھی آپ کے مطالعہ میں آئی ہی نہیں۔

محترم بزرگ! اس اشکال کا حل عطا کیجئے۔

خیر سے ایک لطیفہ بھی یہاں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت آدمؑ بہکائے میں آکر شجر ممنوعہ نہ کھاتے تو جنت ہی سے کیوں نکالے جاتے اور نہ نکالے جاتے تو صفحۂ ارض پر انسان کا وجود ہی کہاں ہوتا جو عورتوں اور شوہروں کے مسائل پیدا ہوتے۔ روایت بجائے آدمؑ کے حوّا کو اصل خطا کار اور دوہری گناہگار قرار دینے کے لئے یہ ہیرا پھیری کر رہی ہے۔ وہ یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ آدم بھلا شیطان کے جھانسے میں آنے والے کہاں تھے وہ تو حوّا نے بہلا پھسلا کر انھیں شیشے میں اُتارا۔ تو حضور! حوّا اگر نہ بہکاتیں تو آپ انوار الباری لکھنے کے لئے اور ہم اس پر سر دھننے کیلئے کہاں سے آجاتے۔ تعجب ہے، اس عقل و دانش پر جو روایت کی اس داخلی لغویت کا ادراک نہ کر سکی۔

پھر ایک اور تماشا۔ کیا بیویاں ہی شوہروں کو غلط کام کرنے پر آمادہ کرتی ہیں اور شوہر کبھی بیویوں کو غلط راہ پر نہیں لگاتے؟ کون صحیح الدماغ ایسی بات کہے گا۔ بہتیرے شوہر تو اپنی شیطانی اسکیموں میں عورت غریب کو اس طرح کٹ پتلی بناتے ہیں کہ الامان والحفیظ۔ یہ جو بار بار آپ یہ فرمائے جا رہے ہیں کہ عورتوں کے وسیلے سے مردوں کو ہموار کر لیا جاتا ہے تو یہ بھی اصل قصور عورتوں کا کہاں ہوا۔ عورتوں کو ذریعہ بنانے والے تو مرد ہی ٹھیرے۔ کیچوا بیچارہ خود بڑھ کر کانٹے میں نہیں بندھ جاتا شکاری اُسے بندھتا ہے اسی طرح یہودی عورتوں نے اگر مصری مردوں کو جال میں پھانسا یا جہاں بھی کوئی اسکیم عورتوں کے توسط سے رُوبہ کار لائی گئی وہاں اسکیم ساز اور اصل شکاری تو مرد ہی تھے نہ کہ عورتیں۔

اور پھر اس روایت کے مطابق اگر بیویوں کا شوہر کو بہکانا ثمرہ ہے اس بات کا کہ حوّا نے آدم کو بہکایا تھا تو مرد جو عورتوں کو بہکاتے ہیں یہ کس بات کا ثمرہ ہے جبکہ حضرت آدمؑ نے تو کسی کو نہیں بہکایا؟ منطق اگر آپ نے پڑھی ہو تو ہم نہیں سمجھتے کہ کس طرح ایسی واہی روایت کو آپ کے معدے نے قبول کر لیا۔ حوّا کی طرف آدم کو بہکانے کی نسبت کئے بغیر اگر یہ ممکن نہ تھا کہ عورتیں شوہروں کو بہکاتیں، تو پھر آدمؑ کی طرف بھی کسی کو بہکانے کی نسبت ضرور کیجئے ورنہ یہ

کیسے ممکن ہوا کہ مرد و عورت کو بہکائے چلے جا رہے ہیں۔

بہر حال یہ تو اس روایت کے داخلی اور منطقی عیوب تھے۔ سب سے بڑا اشکال ہمیں وہی ہے کہ یہ قرآن کے بیانِ محکم سے ٹکرا رہی ہے اور خالقِ کائنات کی تکذیب کر رہی ہے ـــــ محترم سید صاحب کے خزانۂ علم و استدلال میں اگر اس اشکال کا کوئی حل ہے تو بسم اللہ۔ تجلی اپنے صفحات ہدیۂ خدمت کرتا ہے۔

چند نکات

معلوم ہے کہ شیطان سجدہ نہ کرنے کے جرم میں جنت سے نکال دیا گیا۔ ابھی آدم و حوّا جنت ہی میں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان نے پھر کیسے انھیں بہکانے کا موقعہ پالیا؟۔

اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں اور علمائے سلف نے دونوں ہی دیئے بھی ہیں کہ:۔

(۱) شیطان اگرچہ نکال دیا گیا تھا مگر یہ حکم جاری نہیں کیا گیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی جنت میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ قرآن اس معاملے میں خاموش ہے لہٰذا عین ممکن ہے کہ شیطان گاہے گاہے اندر گھس آتا ہو۔

(۲) شیطان کو اللہ نے خاص قسم کی قوتیں دی ہیں۔ اسے یہ بھی قوت ہے کہ دور رہ کر کسی کے قلب میں وسوسہ ڈالے لہٰذا ضروری نہیں کہ بہکانے کے لئے اسے جنت ہی میں آنا ضروری ہو۔

ہم پہلی رائے کو زیادہ قوی سمجھتے ہیں جس کے دلائل یہ ہیں:۔

اوّل یہ کہ پہلی دو آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ شیطان نے ان دونوں کو ورغلایا اور ان کے دلوں میں وسوسہ ڈالا یہ بات اس وقت بھی کہی جا سکتی ہے جب کہ شیطان نے غائبانہ طور پر وسوسہ ڈالا ہو اور اس وقت بھی کہی جا سکتی ہے جب آمنے سامنے گفتگو کر کے ورغلایا ہو۔ اس کی مثالیں ہمارے روزمرہ میں عام ہیں۔ زید طرح طرح کی ظاہر فریب باتیں کہہ کے طلحہ کو برائی کے راستے پر لے جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ طلحہ کو زید نے ورغلایا۔ گویا پہلی دونوں آیتیں ثابت نہیں کر رہی ہیں کہ شیطان نے دور رہ کر ورغلایا بلکہ رو در رو باتیں بنا کر ورغلایا ہو تب بھی یہ آیتیں اپنی جگہ بے غبار رہتی ہیں۔

البتہ کوئی شخص دور رہ کر زید تک غلط خیالات پہنچائے یا کسی اور کے ذریعہ اسے ورغلائے تو ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں شخص نے زید سے یہ کہا۔ مخلوق کے مابین جب مکالمے کا ذکر ہو اور یہ کہا جائے کہ فلاں نے فلاں سے کہا تو مراد ہوتی ہے آمنے سامنے کہنا۔ آیت نمبر ۳ میں مکالمہ ہی مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ شیطان نے آدم سے کہا۔ اس اندازِ بیان کا مطلب یہ نکالنا کہ شیطان نے جنت سے باہر رہ کر آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا ذرا دور کی بات ہے۔ خلافِ محاورہ ہے۔ آج جب کہ ٹیلیفون اور ٹرانسمیٹر چل گئے ہیں تب بھی ہم یوں بولتے ہیں کہ الف نے جیم سے ٹیلیفون پر ایسا کہا۔ گویا درمیانی واسطے کی صراحت کر دیتے ہیں۔ اگر صراحت نہ ہو تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ بالمشافہ کہا۔ خلاصہ یہ کہ شیطان کے جنت میں داخل ہو کر آمنے سامنے بہکانے کی صورت میں تو تینوں آیاتِ قرآنیہ بغیر تاویل کے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں لیکن دور رہ کر بغیر مکالمے کے وسوسہ ڈالنے کی صورت میں تیسری آیت کی ایسی تاویل کرنی پڑتی ہے جو عام اندازِ گفتگو اور روزمرہ کے خلاف ہے۔

دوسرے یہ کہ ایک جگہ تو اللہ نے اپنا حکم ان الفاظ میں بیان کیا کہ:۔

اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا (طٰہٰ) تم دونوں یکسا جنت سے نکل جاؤ۔

گویا صیغہ تثنیہ۔

لیکن دو جگہ اِهْبِطُوا جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ جمع کا استعمال مجازاً دو پر بھی ہو تو جاتا ہے لیکن جب اطلاقِ حقیقی میں کوئی مانع نہیں تو کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ شیطان بھی اس وقت یہیں موجود تھا اور اس حکم کا

وہ بھی مخاطب ہے۔ فرض کیجئے نوکر کو آپ نے گھر سے نکال دیا۔ وہ کبھی کبھار اندھیرے اجالے پھر گھر میں آگھستا ہے آپ نظر انداز کر جاتے ہیں کیونکہ آپ کی اسکیم میں یہ بات شامل ہے کہ یہ نوکر آپ کے گھر میں بسنے والے دو افراد کو ورغلائے۔ اب یہ ورغلا دیتا ہے تو آپ ڈانٹتے ہیں کہ نالائقو نکلو یہاں سے۔ اس صورت میں یہ نوکر بھی یقیناً آپ کا مخاطب ٹھہرتا ہے۔ حالانکہ آپ اسے اِھبط کہکر دھتکار چکے ہیں لیکن اب پھر چونکہ یہ آمرا ہے اس لئے جمع کا صیغہ استعمال فرماتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ فرمایا گیا:-

اِھْبِطُوْا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ — نکلو یہاں سے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔

حتی کہ جہاں (سورۂ طٰہٰ میں) اِھبطا فرمایا گیا وہاں بھی یہ فقرہ موجود ہے۔

اب اگر یہ سمجھا جائے کہ شیطان اِس وقت یہاں موجود نہیں ہے تو بظاہر مطلب یہ نکلے گا کہ اے آدم و حوا تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ کیا یہ مطلب قابل قبول ہے؟ آدم و حوا کا ایک دوسرے کا مونس و غمگسار ہونا تو قرآن سے ثابت ہے اور اگر مراد مرد اور عورت کی صنفیں لی جائیں تب بھی بات نہیں بنتی۔ اللہ نے تو یہ بتایا ہے کہ عورت مرد کو ہم نے ایک دوسرے کی تسکین بنایا پھر یہ کیا بات ہوئی کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اولیٰ یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اور نوعِ انسان دو فریق ہوں سو یہی ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ شیطان کی دشمنی تو ظاہر ہے ہی مگر انسان بھی اپنی فطرت اور منصبی مقتضیات کے لحاظ سے شیطان کا حریف ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نفس کے چکر میں پڑ کر شیطان سے دوستی گانٹھ لیتا ہو۔ کم سے کم اُس وقت جب کہ جنت سے نکلنے کا حکم مل رہا تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ شیطان آدمی کا دشمن اور آدمی شیطان کا دشمن۔ حضرت آدمؑ و حوا کو کس قدر غصہ آرہا ہوگا کہ اس ملعون نے ہمیں سبز باغ دکھلا کر خدا کا معتوب بنایا اور جنت سے نکلوایا۔

چوتھے یہ کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے:-

"اے آدم و حوا! کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہیں روکا تھا۔ کیا میں نے یہ نہیں بتا دیا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔" (سورۂ اعراف)

یہ فقرہ اسی صورت میں خوب موزوں ہو سکتا ہے جب کہ آدم و حوا شیطان کے رُو در رُو بہکانے سے بہکے ہوں۔ اگر شیطان نے دُور ہی رہتے ہوئے اس طرح غائبانہ وسوسہ ڈالا ہوتا جس طرح ہم انسانوں کے اندر ڈالتا ہے تو یہ بات بہر حال محتاجِ ثبوت رہتی کہ یہ وسوسہ شیطان کا ڈالا ہوا ہے یا خود نفسِ آدم کا۔ کیا قرآن ہی میں نہیں فرمایا گیا کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ۔ سورۂ یوسف (بے شک نفس سکھلاتا ہے برائی) شیطان کا کوئی اثر انسان پر ہو ہی نہیں سکتا تھا اگر خود نفسِ انسانی میں گناہ کی طرف جانے کا رجحان اور استعداد اور مادّہ نہ رکھ دیا گیا ہوتا۔ مجال ہے کسی فرشتے کو شیطان بہکا سکے۔ فرشتوں میں گناہ کا مادّہ ہی نہیں۔

تو ہمارا منشا یہ ہے کہ اگر شیطان نے باہر سے باہر غائبانہ وسوسہ ڈالا ہوتا تو جس طرح ہم انسان قطعیت کے ساتھ ہمیشہ یہ نہیں فیصلہ کر سکتے کہ فلاں برائی کا اصل محرک شیطان بنا یا خود ہمارا نفس۔ اسی طرح آدم و حوا کے لئے آپ سے آپ یہ جان لینا بعید از قیاس تھا کہ یہ شیطان کی کارگذاری ہے۔ اس صورت میں اللہ کا ایسا ایک فقرہ فرمانا جس سے یہ ظاہر ہو رہا ہو کہ آدم و حوا شیطان کی کارگذاری کو اچھی طرح جانتے ہوئے ہیں کچھ دُور کی بات معلوم ہوتی ہے اس صورت میں تو ایسا کوئی اشارہ آیت میں ضرور نظر آتا جس کے ذریعہ آدم و حوا کو یہ بتایا جاتا کہ تم نے جو یہ حرکت کی ہے یہ در اصل شیطان کے بہکانے سے کی ہے۔ وہ دُور رہ کر بھی دلوں میں وسوسے ڈال دیتا ہے۔

یہ چار قرینے ہیں جن کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ شیطان نے جنت میں گھس کر آدم کو آمنے سامنے ہی بہکایا۔ تاہم کوئی اسے نہ مانے تو ہمیں اصرار بھی نہیں البتہ یہ بہر حال طے ہے کہ

چاہے ورغلانا آمنے سامنے ہو یا دور سے ہر شیطان کا مخاطب اور شکار اور اصل نشانہ حضرت آدمؑ تھے نہ کہ حوا اور آیاتِ قرآنیہ کے لازمی مضمرات قطعی طور پر اس اسرائیلی روایت کی تردید کر رہے ہیں جسے سید صاحب اس لئے لے کے بیٹھے ہیں کہ پچھلے بعض بزرگوں نے اسے اہمیت دے لی ہے۔

کیا سید صاحب اس اشکال کا حل پیش فرمائیں گے؟

قیاس تو چاہتا ہے کہ جو فاضلِ مکرم شبلی اور آزاد اور مودودی جیسے اساتذہ کو قلم کی نوک پر رکھ سکتے ہوں انھیں بھلا ہم جیسوں کی الجھن دور کرنے میں کیا دشواری پیش آئے گی جبکہ ہماری حیثیت ان بزرگوں کے شاگردوں کے شاگرد جیسی بھی نہیں۔ خدا جانتا ہے یہ مصنوعی اظہارِ عجز نہیں ہم اپنے کو حقیقتاً اس گدا گر سے زیادہ نہیں سمجھتے جو اربابِ علم و فضل کے دستر خوانوں سے ریزے چن کر اپنا کام چلاتا ہے ورنہ کہاں علم و فضل اور کہاں ہم!

مولانا مودودی کی چند کتابیں

اسلامی تہذیب اور اسکے اصول و مبادی	۳/۷۵
مسلمان کسے کہتے ہیں 〃 〃	۱۵/۰
ایمان کی کسوٹی 〃 〃	۱۵/-
سوچنے کی باتیں 〃 〃	۱۵/-
مسلم اور کافر کا اصلی فرق 〃	۱۵/-
خدا کی اطاعت کس لئے 〃	۱۵/-
نمازیں کیوں بے اثر ہوگئیں 〃	۱۵/-
جہاد کیا ہے؟ 〃	۴۰/-
حکومتِ الٰہیہ کیا ہے؟ (زیرِ طبع)	

مکتبہ آل انڈیا جماعتِ اسلامی ۱۰-۲-۳۰۰/۴۸ وجیانگر۔۔۔

خواتین اور طالبات کے پاکیزہ ماہنامہ "حجاب" کا

مسلم پرسنل لانمبر

جولائی کے پہلے ہفتے میں منظرِ عام پر

• آسان زبان اور دل کش اندازِ بیان • مسلم پرسنل لا سے متعلق دلچسپ اور مؤثر افسانے • مسلم خواتین اور طالبات کی دینی حمیت کا مظاہرہ اور ان کی طرف سے بھرپور نمائندگی • سوکن کے سوال پر مشہور صاحبِ قلم امریکن نو مسلم خاتون مریم جمیلہ کا مدیر حجاب کو جواب • مسلم معاشرے کے تحت۔ طلاق، خلع، نے پالک، پوتے کی وراثت، تعدد ازدواج، مرد کی قوامیت، ایلا، ظہار، کلالہ، اسلامی معاشرہ میں مرد اور عورت کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے مسائل پر عبرتناک واقعات اور چھوٹے چھوٹے مضامین۔

اسلام میں چار بیویوں کی اجازت پر ابن بطوطہ کے بیٹے کی عجیب و غریب منطق

• خواتین کے اجتماعات کی کارروائیاں اور قراردادیں۔ • مسلم قائدین کی تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات آسان زبان اور دلچسپ اندازِ بیان میں حجاب کا یہ مسلم پرسنل لانمبر اپنی نوعیت میں منفرد۔ آج ہی اپنے ایجنٹ کے یہاں حجاب کے مسلم پرسنل لانمبر کی کاپی محفوظ فرمالیں یا ماہنامہ حجاب کے سالانہ خریدار بنکر تقریباً دو سو صفحات کا یہ ضخیم نمبر مفت حاصل کریں۔ قیمت مسلم پرسنل لانمبر۔ تین روپے ۳/-

سالانہ چندہ حجاب — دس روپے۔

رجسٹری فیس برائے پرسنل لانمبر — ایک روپیہ

منیجر:۔ ماہنامہ حجاب۔ رامپور (یوپی)

اسلام میں عدلِ اجتماعی

سید قطب شہیدؒ کی ایک معرکۃ الآرار تصنیف. جس کا سلیس اردو ترجمہ جناب نجات اللہ صدیقی نے کیا ہے نوابواب پرشتمل نفیس بحثیں ۔ اور علمی وتاریخی لعل وجواہر
قیمت ــــ آٹھ روپے

تحریک اسلامی ہند

مولانا صدرالدین اصلاحی کے قلم سے اسلامی تحریک کا مفصل تعارف اور یہ وضاحت کہ یہ تحریک کوئی نئی تحریک نہیں بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہی تحریک ہے جسے بڑے بڑے اولیاء اللہ اور مصلحین امت چلاتے آرہے ہیں ۔ جن لوگوں کو اس تحریک کے بارے میں تسلی بخش معلومات حاصل کرنی ہوں وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں. قیمت مجلد تین روپے ۔/۳

مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد

مولانا عبیداللہ سندھی ماضی قریب کی ایک معروف شخصیت ہیں، ان کی وفات پر ماہنامہ "معارف" میں ایک سخت تنقید چھپی تھی۔ اس کا علمی جائزہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے ماہنامہ "برہان" میں لیا۔ یہی نقد وجائزہ کتابی شکل میں پیش خدمت ہے۔ بہت دلچسپ، فکر انگیز اور معلومات افزا۔ قیمت مجلد پانچ روپے ۔/۵

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے خطبات

جن بزرگ کو عام طور پر غوثِ اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ۔ ان کے ایمان افروز خطبات. قیمتی نصائح اور بیش بہا لطائف سے مالا مال ۔
قیمت مجلد ــــ ساڑھے سات روپے ۷/۵۰

تاریخ دیوبند

جناب سید محبوب رضوی کی یہ تاریخ کافی شہرت پاچکی ہے اب اس کا نیا ایڈیشن نظرثانی اور ضروری اضافات کے ساتھ بڑی آن بان سے چھپا ہے ۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔
قیمت مجلد آٹھ روپے ۔/۸

غالب

غالب علیہ الرحمۃ کے حالاتِ زندگی. غلام رسول مہر کے قلم سے ۔ غالب کون تھے، کیا تھے، کن حالات میں ان کی زندگی بسر ہوئی اور کیا کیا عبرتیں ان کے حالات سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ سب جاننے کے لئے یہ تحقیقی کتاب ضرور ملاحظہ کیجئے۔ قیمت مجلد دس روپے ۔/۱۰

ارمغان حجاز باتشریح

ڈاکٹر اقبالؒ کے مشہور مجموعہ کلام "ارمغانِ حجاز" کی شرح پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے قلم سے۔ زبان سلیس انداز دلکش، تفہیم دلکش ۔قیمت مجلد چھ روپے ۔/۶

اردو عربی ڈکشنری

کسی بھی اردو لفظ کا عربی مرادف معلوم کرنے کے لئے یہ ڈکشنری بہت عمدہ ہے اس کے مرتب دہی مولانا عبدالحفیظ علیہ الرحمۃ ہیں جن کی مصباح اللغات مقبولِ عام ہوچکی ہے ۔
قیمت مجلد ــــ نو روپے ۔/۹

ھر قسم کی کتابیں
مندرجہ ذیل پتہ سے طلب فرمائیں

مکتبہ تجلّی ۔ دیوبند (یوپی)

بطفیل فلاں میری فلاں مشکل حل کر دیجئے تو اس طریق دعا پر عمل سلف میں سے کسی نے بھی نہیں کیا"۔

(روح المعانی کے افادات یہاں ختم ہو گئے)

اب پھلی تمام معروضات کا حاصل اور خلاصہ دیکھ لیا جائے۔

(۱) مناجات مقبول کریمی یا حصن حصین یا کسی اور کتاب میں بخاری کے حوالے سے جو انبیاء و صلحاء کے توسل کی تعلیم دی جاتی ہے وہ سراسر مغالطہ انگیزی ہے جو فریب دہی کی حد تک جا پہنچی ہے۔

(۲) اس حدیث سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کے نزدیک اس معنی میں توسل درست ہی نہیں تھا جس معنی میں آجکل تعلیم دی جا رہی ہے — وہ توسل کہتے تھے کسی سے دعا کی درخواست کو اور یہ درخواست وہ صرف زندوں سے جائز تصور کرتے تھے۔ حتی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے تو انھوں نے ان تک سے توسل کو جائز نہیں مانا اور ان کے بجائے ان کے چچا عباس سے دعا کی درخواست کی۔

(۳) صحابہ میں ایسا کوئی تصور ہی سرے سے نہیں پایا جاتا تھا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان کی قبروں پر جا کر عرض کیا جائے کہ ہمارے لئے دعا فرمائیے۔ حتی کہ جس آخری پیغمبر کے لئے قبر میں ایک طرح کی زندگی ان کے علم میں تھی اس سے بھی دعا کی درخواست کو وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے اور وقتاً فوقتاً بے شمار ضرورتیں اور الجھنیں اور مصیبتیں آنے کے باوجود انھوں نے نہ تو کبھی قبر رسولؐ پر آ کر امداد طلب کی نہ کوئی بھی ایسا عمل کیا جو آجکل اولیاء اللہ کی قبروں پر عام ہے۔ ان کے لئے اس طرز عمل کے کوئی معنی ہی نہیں تھے کہ مرے ہوئے لوگوں سے مدد کی توقع رکھی جائے۔ حتی کہ جو آخری پیغمبر ابھی ان کے سامنے ہی دنیا سے سدھارا تھا اور اس پر درود و سلام کی انھیں ہدایت ملی تھی اس سے بھی انھوں نے امداد و اعانت کی توقع نہیں کی۔ پھر بھلا اس کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی اور مرے ہوئے بزرگ سے وہ توقع رکھتے۔ ان کا یہ رویہ دلیل مبین ہے اس بات کی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں جو تعلیم دی تھی اس میں اس طرح کے تصورات کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

(۴) آپ نے دیکھا کہ ایک صحابی خشک سالی کی انتہائی پریشانی میں بیتاب ہو کر قبر رسول پر دعا کی درخواست کرنے چلا ہی جاتا ہے تو خواب میں اسے کیا تعلیم ملتی ہے یہی کہ دعا زندوں سے کراؤ۔ خلیفۂ وقت عمرؓ کے پاس جاؤ۔ میں زندگی میں تمہارے لئے دعا کرتا تھا۔ اب اس کا موقعہ نہیں رہا۔

یہ ہے وہ خلاصہ جو حدیث صحیح اور عمل صحابہ سے نکلتا ہے۔ اب انشاء اللہ اگلی صحبت میں ہم بعض اور روایات کی حقیقت پر روشنی ڈالیں گے جنھیں اس سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق وہو المستعان۔ ایاہ نعبد و ایاہ نستعین ؞

امت مسلمہ کی رہنمائی
حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں

مولانا تقی امینی کی ایک تازہ تصنیف۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں حضرت عمر کے اصلاحی زمودات و اقدامات۔ دور رس حکمتوں سے لبریز۔ قیمت دو روپے ۲/-

نفاق

علامہ ابن قیمؒ کے ایک قیمتی رسالہ کا اردو ترجمہ آیات قرآنی کی روشنی میں یہ وضاحت کہ نفاق کسے کہتے ہیں اور اس کے کیا خواص ہیں۔ بہت ہی مفید رسالہ ہے ——— قیمت ۷۵ پیسے۔

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

تمام مخلوق کے سردار، ہم سب کے محبوب و مقتدا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کی

ایک مستند، مفصل اور روح پرور سیرت

سیرتِ حلبیہ (اردو)

اُردو میں سیرت کی بہت کتابیں موجود ہیں جو اپنی جگہ بیش قیمت ہیں لیکن اب سے تقریباً تین سو برس پہلے کے ایک عالم علی ابنِ برہان الدین حلبیؒ کی سیرت حلبیہ اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہے، اس لئے جناب محمد اسلم قاسمی نے اس کے اردو ترجمہ کا اہتمام کیا اور کم استطاعت عوام تک پہنچانے کے لئے اسے قسط وار چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ چنانچہ اب تک ۱۲ قسطیں چھپ چکی ہیں۔ اور دوسرے مہینے قسط آجاتی ہے۔

خریداری کا آسان طریقہ

آپ ایک روپیہ ۱/ بھیجکر ممبر بن جائیں۔ فوراً آپ کو پہلی دو قسطیں ڈاک خرچ معاف کر کے صرف پانچ روپے بیس پیسے ۵/۲۰ کی وی پی سے بھیجدی جائیں گی۔ ہر دوسرے مہینے اگلی دو قسطیں اسی طرح پیش کی جائیں گی آپ چاہیں تو بجائے دو ماہ کے ایک ماہ بعد کا پروگرام بنالیں۔ ۱۲ قسطیں چونکہ موجود ہیں اس لئے انھیں آپ کی مرضی کے مطابق آپ ہی کے بتائے ہوئے وقت پر بھیجا جاسکتا ہے۔ آپ چاہیں تو ایک وقت میں دو سے زائد بھی طلب فرما سکتے ہیں۔ البتہ جب شائع شدہ قسطیں آپ تک پہنچ جائیں گی تو اس کے بعد ہر قسط دو ماہ بعد ہی حاصل کر سکیں گے۔

امید ہے کہ اہلِ ذوق اس سلسلے سے فائدہ اٹھائیں گے

منیجر

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یوپی)

مذاکرۂ علمیہ

تفسیرِ ماجدی (جلد دوم)

تفسیر ماجدی جلد دوم ہمارے سامنے ہے۔ اس پر تبصرہ ہم "کھرے کھوٹے" کے بجائے مستقل ایک مضمون کی شکل میں کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کی اہمیت اسی کی طالب ہے۔ اہمیت ہی کے پیشِ نظر ہم اس تبصرے کو تقابلی مطالعہ کا انداز دیں گے یا پھر مذاکرۂ علمیہ کہہ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ فاضل مفسر مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے انھوں نے مفسرینِ قرآن کے گروہِ سعید میں شامل ہو کر اپنے لئے آخرت کا بڑا سرمایہ کما لیا ہے۔ انشاءاللہ۔

اردو میں بہترین تفسیریں طبع ہو چکی ہیں لیکن یہ امتیاز کسی کو حاصل نہیں کہ مستند عربی تفسیروں اور کتبِ اصول و فقہ کی اصل عبارتوں کے ٹکڑے بھی ان میں نقل ہوں۔ حضرت ممدوح نے مفسرینِ سلف اور علماء قدیم کے فرمودات کو ان کے اپنے الفاظ میں شاملِ تفسیر کر کے پڑھنے والوں کے لئے اطمینان مہیا کر دیا ہے کہ وہ اپنے جی سے کوئی رائے اختراع نہیں کرتے بلکہ بڑوں ہی کا اتباع کرتے ہوئے چلتے ہیں۔

ہم جیسے خوشہ چینوں اور کم عیاروں کے لئے یوں بھی یہ تفسیر بے حد مفید ہے کہ بہت سے وہ معارف و مسائل جن تک پہنچنے کے لئے ضخیم مجلدات کی ورق گردانی ضروری ہوتی ہے وہ اس میں بلا محنت نکلے مل جاتے ہیں۔ حضرت مفسر نے جس قدر عرق ریزی کی ہے اس کا اندازہ مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔

تفسیر [illegible]: صدقِ جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ لکھنؤ

جلد اول پہلے چھپ چکی ہے۔ یہ جلد دوم ہے جو سورۂ نساء سے سورۂ توبہ تک کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ بڑے سائز کے ۵۰۰ صفحات۔ انڈیکس کے دس صفحات اس کے علاوہ۔

کاغذ سفید، کتابت اچھی۔ چھپائی زیادہ تر اچھی۔ کہیں کہیں جلتی ہوئی۔ ہدیہ غیر مجلد پندرہ روپے۔

ابتدا میں چھ صفحات کا افتتاحیہ ہے جس کی سطر سطر قیمتی اور مفید۔ زبان کا لطف کیا کہئے کہ مولانا دریابادی کا نام ہی کافی ضمانت ہے۔ فکر کی پختگی اور رائے کی اصابت اس نام کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے جیسے چمن کے ساتھ خوشبو اور شب ماہ

کے ساتھ دلکشی۔ وہ اپنے انداز کے ایک ہی لکھنے والے ہیں۔ اور دو ہی سطر پڑھکر بلکہ بعض اوقات تو ایک ہی فقرہ پڑھکر ضرورت ہی نہیں رہتی کہ لکھنے والے کا نام دریافت کیا جائے۔

ہم جیسا بے بضاعت ان کی تفسیر پر تبصرہ کرے تو یہ ایک طرح کی گستاخی ہوگی لیکن اَلْاَمْرُ فَوْقَ الادب۔ پہلے جو نسخہ آیا تھا وہ ہم نے کہیں گم کر دیا۔ ناشر محترم نے دوبارہ بھیجنے کی زحمت فرمائی۔ اسے حکم نہیں تو کیا سمجھیں حکم ملا ہے تو تبصرہ کرنا ہی ہوگا۔ تبصرہ کچھ زیادہ مشکل نہیں اگر وہی روش اختیار کی جائے جو ہمارے زمانہ میں عام ہے۔ چند ورق ادھر سے الٹے چند ورق اُدھر سے الٹے۔ تھوڑی سی تعریف کی ہو گیا تبصرہ مکمل۔ ایک صاحب نے تو اس سے بھی آسان ترکیب نکالی ہے کتاب کی کچھ سطروں پر نشان لگاکر کاتب کو دیدیئے کہ نقل کر دو یہاں سے اور شروع میں لکھ دیا کہ ناشر یا مصنف ایسا فرماتے ہیں بس ہو گیا تبصرہ۔

پورے آٹھ سو طویل و عریض صفحات۔ لکھائی بھی موٹی نہیں سب کو حرفاً حرفاً پڑھنا ایک ایسے شخص کے لئے جیسے کہ ہم ہیں کتنا آسان یا کتنا مشکل ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو تجلی کو برابر پڑھتے ہیں پھر بھی ہماری کوشش ہے کہ یہ ہفت خواں طے کر ہی لیں واللہ المعین۔ تبصرے کا یہ دروبست مناسب معلوم ہوا کہ جہاں تک متن قرآن اور ترجمے کا تعلق ہے اس پر تو ایک ہی صحبت میں اظہار خیال کر دیا جائے البتہ تفسیری نوٹوں پر گفتگو ہر صورت کو مستقل مان کر ہو اس طرح مجلسیں تو متعدد ہو جائیں گی لیکن حق تبصرہ بھی کھل کر ادا ہوگا۔ یہ خوش فہمی ہمیں ہرگز نہیں کہ اس کار اہم کی اہلیت بھی ہم میں پائی جاتی ہے۔ ایک تو تفسیر قرآن۔ پھر مفسر مولانا دریا بادی جیسے فاضل بزرگ۔ بھلا ہماری بساط ہی کیا جو انہیں انگلی رکھ سکیں مگر لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا سے ہمت بندھتی ہے کہ جہاں کہیں ہم سے نادانستہ خطا ہو جائے اللہ غفور و رحیم اس کی معافی بھی دے دے۔

ہم بدقسمتی سے حافظ نہیں ہیں یہ اور مشکل قرآن کی صحیح کتابت بجائے خود ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ تبصرہ تشنہ رہے گا اگر سب سے پہلے اسی مسئلہ کو نہ لیا جائے۔ ہم دورانِ تلاوت میں جو خامیاں محسوس کر سکے ہیں انھیں پیش کئے دیتے ہیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں تصحیح کرائی جا سکے۔ چونکہ حافظ نہیں ہیں اس لئے عین ممکن ہے کہ کچھ فروگذاشتیں پڑھنے میں آنے سے رہ بھی گئی ہوں۔ اگلے ایڈیشن کے وقت ناشر خود بھی نظر ثانی فرمالیں تو بہتر ہوگا۔

مجموعی طور پر تصحیح نہایت عمدہ ہے لیکن آج کل مصیبت ہو گئی ہے کہ طباعت کے بعض مراحل میں صحیح کو بھی غلط کر دیا جاتا ہے مثلاً کاپی پلیٹ پر ملکی جی۔ کسی حرف پر پیش تھا وہ جزم بن گیا۔ اب مصحح صاحب اصل سے رجوع کی زحمت کیوں اٹھانے لگے جزم ہی کو "پکا" کر دیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دھندلے حرفوں کی تصحیح مصحح صاحب اپنی عقل کے بھروسے پر کر ڈالتے ہیں اور پھر چھپنے کے بعد ناشر سر پیٹتا رہ جاتا ہے۔ خود ہمیں تجلی کے سلسلہ میں بڑے بڑے لطائف کا سامنا پیش آتا ہے لہٰذا کسی غلطی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کاتب کی ہے مصحح کی ہے یا کسی اور مرحلے میں ولادت پا گئی ہے۔ بہرحال کتابی غلطیوں سے حضرت مفسر کا کوئی تعلق نہیں اور سچ پوچھئے تو کسی کا بھی کوئی تعلق نہیں بس تقدیر ہی کو برا بھلا کہتے رہیئے۔

نہایت عمدہ تصحیح کے باوجود متن قرآن میں جو اسقام رہ گئے ہیں ان کا گوشوارہ ہدیۂ ناشر ہے۔ صفحہ کے ساتھ سطر کا التزام اس لئے نہیں کیا جا رہا کہ ہر صفحہ پر چند ہی سطریں متن کی ہیں۔ کہیں تو ایک ہی سطر ہے یہ اور بتا دیں بعض بہت ہی معمولی فروگذاشتوں کو ہم نظر انداز کر رہے ہیں۔ مثلاً دو حرفوں کو ملانے والی تشدید بے شمار جگہ کم ہے۔ جیسے صفحہ ۷ پر عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔ کہ مُّهِين کے میم پر تشدید چاہیئے مگر نہیں ہے یا جیسے صفحہ ۳۰ پر اِثْمًا مُّبِيْنًا میں مبینا کے میم پر تشدید رہ گئی۔

نہ جانے کتنی جگہ زبر زیر پیش رہ گئے ہیں۔ جیسے صفحہ ۳۵۰ پر تَاْتِيْهِمْ دھا کا زیر رہ گیا۔ کوئی اسے تَاْتِيْهُمْ بھی پڑھ سکتا ہے یا جیسے ص۳۶۰ پر قُلِ اللّٰهُ (کہ قُل کے لام پر کوئی اعراب نہ ہونے کی بنا پر ضروری نہیں کہ ہر شخص قُلِ اللّٰهُ ہی پڑھے یا جیسے ص۳۶۵ پر اَلَا (کہ الف پر کوئی اعراب نہیں۔ پڑھنے والا اِلَّا بھی پڑھ سکتا ہے)، یا جیسے ص۴۴۵ پر یَاْهُوا يُهِمْ رَبّ پر کوئی اعراب نہیں ہے)، یا جیسے ص۶۷ پر واللّٰہ (کہ ھا پر کوئی اعراب نہیں)، ہم نے اس طرح کی فروگذاشتوں کو جمع نہیں کیا۔

ایک اور قسم کے تسامحات ہیں جن کی نشاندہی کا اہتمام ہمارے لئے بہت مشکل ہے ان کا تعلق رسم الخط سے ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ قرآن کا رسم الخط بھی ایک مستقل فن ہے۔ کتابتِ قرآن میں اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مثلاً لفظ اَفْئِدَۃ ہے یہ فؤاد کی جمع ہے اور کسی بھی عربی لغت میں دیکھ لیجئے اس کی کتابت یوں ملے گی اَفْئِدَۃ بعض حضرات ہمزہ اوپر لگا دیتے ہیں۔ بہرحال دو شوشے ضرور ملیں گے مگر قرآن میں یہ لفظ گیارہ جگہ آیا ہے اور صرف ایک جگہ ہے جہاں یہ افئدۃ شوشے کے ساتھ لکھا جائے گا (سورۂ ابراہیم آیت ۳۷ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ) باقی دسوں مقامات پر اسے اَفْـِٕدَۃ (بغیر شوشے کے لکھیں گے)

لیکن زیرِ تبصرہ نسخہ میں یہ سورۂ انعام کی آیت ۱۱۳ میں اَفْئِدَۃ کتابت ہو گیا۔ ناشر یہ گمان نہ فرمائیں کہ ہم خواہ مخواہ خوردہ گیری کر رہے ہیں اور ایک لفظ جب دونوں طرح قرآن میں لکھا موجود ہے تو کیا ضروری ہے کہ کسی ایک رسم الخط کا التزام کیا جائے۔ نہیں اس فن پر تو مستقل کتابیں ہیں۔ یہ خدا کی کتاب کا معاملہ ہے جس کا ایک حرف تو کیا ایک ایک شوشہ اور علامت اور نشان بیش قیمت ہے۔ چند مثالیں ہم ناشر کے اطمینان اور عام بھائیوں کی معلومات کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ھٰؤُلَآءِ ھٰاَنْتُمْ۔ اُولٰٓئِکَ۔ لٰکِنَّ۔ یہ الفاظ قرآن میں اسی طرح لکھے جائیں گے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ صوت و آہنگ کا لحاظ کر کے یوں لکھ دیا جائے ھاؤلاءِ ھا انتم اولائِکَ۔ لاکِنَّ یہ ایسے الفاظ کی مثال ہے جو کسی بھی جگہ اپنی شکل نہیں بدلیں گے اب دیکھئے ایسے الفاظ جو قرآن ہی میں دو طرح سے لکھے جائیں گے اور ہر شکل کی جگہ متعین ہے۔

مثلاً لفظ سبحان قرآن میں تقریباً چالیس جگہ آیا ہے اب جتنے بھی صحیح ترین مصحف آپ دیکھیں ان میں ہر جگہ اسے اس طرح لکھا پائیں گے سُبْحٰنَ (یعنی سبحان نہیں) لیکن صرف ایک مقام ہے جہاں اس کے خلاف ملے گا (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۳ سُبْحَانَ رَبِّیْ) اور یہاں اسی طرح لکھنا احوط اور اصح ہے۔

برخلاف اس کے اَلرَّحْمٰن کا لفظ یہ قرآن میں کسی جگہ بھی الرَّحْمَان نہیں ملے گا اگر ملے تو اسے بے احتیاطی سمجھئے۔

اور مثلاً جتنے بھی نام قرآن میں ایسے آئے ہیں جو تین حروف سے زائد کے ہیں اور ان کے بیچ میں کہیں الف موجود ہے تو یہ الف نہیں لکھا جائے گا جیسے صالح، ابراھیم، میکال انھیں یوں لکھیں گے صٰلِح۔ ابرٰھیم۔ میکٰل یا میکٰیل، لیکن چار نام اس سے مستثنیٰ ہیں یاجوج۔ ماجوج۔ ھامان۔ جالوت۔ انھیں بغیر الف کے نہیں لکھا جاسکتا (یعنی یٰجوج۔ مٰجوج وغیرہ نہیں لکھ سکتے)

اور یہیں یہ بھی دیکھئے کہ لفظ ابراھیم قرآن میں پچاس سے زائد بار آیا ہے لیکن صرف نو جگہ اسے یا کے بغیر ابراھٖم لکھیں گے اور یا کی آواز کھڑے زبر سے پیدا کریں گے باقی سب جگہ یا کے ساتھ ابرٰھیم یہ نو کی نو جگہیں سورۂ بقرہ میں ہیں باقی کسی سورت میں بغیر یا کے لکھنا صحیح نہیں۔

لفظ کتاب قرآن میں کم و بیش ڈیڑھ سو بار آیا ہوگا مگر صرف چار مقام ہیں جہاں اسے الف کے ساتھ لکھنا چاہیئے (۱) سورۂ رعد کی چوتھی آیت لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ میں (۲) سورہ حجر کی چوتھی آیت کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ میں (۳) سورہ کہف کی ۲۷ ویں آیت کِتَابُ رَبِّکَ میں (۴) سورہ نمل کی پہلی آیت کِتَابٌ مُّبِیْنٌ میں۔ باقی ہر جگہ بغیر الف کے۔ کِتٰب۔

اندازہ فرمائیے کہ سورۂ حجر کی پہلی ہی آیت میں لفظ کتاب موجود ہے مگر اسے کتاب نہ لکھیں گے بلکہ کتٰب لکھا جائیگا حالانکہ اس کی چوتھی آیت میں کتاب (مع الف) لکھنا اصح ہے۔ اسی طرح کِتَابٌ مُّبِیْنٌ کے الفاظ سورۂ مائدہ آیت نمبر ۱۵ میں موجود ہیں لیکن وہاں آپ کتٰب ہی لکھا پائیں گے جبکہ اسے سورۂ نمل میں الف کے ساتھ جائے گا (کتاب)

حد ہے کہ خافون۔ فارسلون۔ اَطِیعون۔ اِتّقون۔ ارھبون۔ اُعبدون سب کے آخر کی یا حذف کرنا ضروری ہے مگر سورہ یٰسٓ کی آیت نمبر ۶۱ میں اعبدُونی یا سمیت لکھنا پڑے گا یا حذف نہیں کر سکتے۔ حالانکہ جتنی بھی جگہ اعبدون آیا ہے وہاں معناً یا موجود ہے بس کتابت میں نہیں آتی۔

مثالیں بہت ہوگئیں حالانکہ یہ سو میں دس بھی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ سورۂ بنی اسرائیل کے زیر تذکرہ مقام پر افئِدَۃ ہی لکھا جائے گا افیِدَۃ نہیں اور پوری جلد میں ناشر کو بہت غور سے رسم الخط پر نگاہِ غور ڈال لینی چاہیے۔

متن ہی میں اور طرح کی غلطیوں کا ہم نے احاطہ نہیں کیا جیسے صـ۱۶ پر حاشیہ نمبر ۲۴ کا ۲۲۵ بن گیا۔ یا صـ۲۹ پر لَا کا پیش دو بن گیا دَزَوۡجٍ وَّ اٰتَیۡتُمۡ زوج کے اوپر لَا تھا جو پیش نظر آرہا ہے، یا مثلاً متعدد جگہ آیات کے نمبر تو ہیں مگر دائرے غائب ہیں حالانکہ سب جگہ دائروں ہی میں نمبر لکھے گئے ہیں۔ یا مثلاً سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۸۹ کے بعد ۱۹۰ آنے کے بجائے ۱۸۷ آگیا جس کے نتیجے میں آخر تک سارے نمبر غلط ہوتے چلے گئے اور سورۂ اعراف میں ۲۰۳ آیات شمار ہوئیں جبکہ صحیح شمار ۲۰۶ ہے

غرض قلتِ وقت کی بنا پر ہم تمام طباعتی نقائص کا گوشوارہ تیار نہیں کر سکتے لیکن اعراب والفاظ کی اغلاط کا نقشہ حاضر ہے ساتھ ساتھ صحیح اعراب والفاظ بھی بالمقابل دیدیئے گئے ہیں۔

صفحہ	غلط	صحیح
۳۱	اُمَّهٰتُكُمۡ	اُمَّهٰتُكُمۡ
۸۲	اَكُنۡ	اَكُنۡ
۱۱۷	خَوَّ اتًا	خَوَّانًا
۲۳۴	مِثۡلَ	مِثۡلَ
۲۶۴	اَنۡزَلَ	اَنۡزَلَ
۲۹۴	مَا الۡمَسِيۡحُ	مَا الۡمَسِيۡحُ
۳۱۰	فِي الۡخَمۡرِ	فِي الۡخَمۡرِ
۳۱۶	هٰذَا يَا بَلِغَ	هٰذَا يَاۡمِ بَلَغَ
۳۶۵	يَجَادِلُوۡنَكَ	يُجَادِلُوۡنَكَ
۳۷۰	يجحد ون	يجحدون
۳۷۱	قَبۡلِكَ	قَبۡلِكَ
〃	اٰتَيۡهُمۡ	اٰتَيۡهُمۡ
۳۷۵	اٰتٰكُمۡ	اٰتٰكُمۡ
۳۹۷	الذِّكۡرٰى	الذِّكۡرٰى
۴۰۰	اُبۡسِلُوۡ	اُبۡسِلُوۡا

صفحہ	غلط	صحیح
۴۱۲	اِبۡرٰهِيۡمُ	اِبۡرٰهِيۡمَ
۴۱۹/۴۲۰	لَوۡ لَمۡ تَعۡلَمُوۡا	لَمۡ تَعۡلَمُوۡا
۴۲۳	اَيۡنَ يُهُمۡ	اَيۡدِيۡهِمۡ
۴۴۱	افيدة	اَفۡئِدَةً
۴۵۴	مَثۡوٰ لَكُمۡ	مَثۡوٰىكُمۡ
۴۵۹	لَاٰيٰتٍ	لَاٰيٰتٍ
۴۷۲	بِبَغۡيِهِمۡ	بِبَغۡيِهِمۡ
۴۷۷	مَنۡهَا	مِنۡهَا
۴۸۵	مِنۡ جَاءَ	مَنۡ جَاءَ
۵۰۶	سَوۡاٰتِكُمۡ	سَوۡاٰتِكُمۡ
۵۵۷	اٰمَنُوۡا	اٰمَنُوۡا
۶۱۵	ذُرِّيَّةً	ذُرِّيَّةً
۶۱۹	فَادۡعُوۡهُمۡ	فَادۡعُوۡهُمۡ
۷۱۰	اَقَامَ	اَقَامَ
۷۱۴	بِاَمۡرِهٖ	بِاَمۡرِهٖ
۷۲۰/۷۲۱	بِالۡيَوۡمِ	(ڈبل لکھا گیا)
۷۴۱	ابۡتَغَوُا الۡفِتۡنَةَ	ابۡتَغَوُا الۡفِتۡنَةَ
۷۴۴	مَغٰرٰتٍ	مَغٰرٰتٍ
۷۵۰	خَيۡرٌ لَّكُمۡ	خَيۡرٍ لَّكُمۡ

صـ۷۲۵ بعضہم فی الحیوٰۃ —— بعضہم بعضًا فی الحیوٰۃ

تفسیری عبارتوں میں بھی کتابتی اغلاط اور فرد گذاشتیں قابلِ لحاظ حد تک ہیں مثلاً صـ۸ پر " ڈاکٹر کی جگہ ڈاکٹروں"۔

صـ۳۶ پر :- "نفس خرچ نکاح دونوں میں مشترک رہتا ہے"۔ صحیح عبارت یوں ہوگی " نفس خرچ نکاح اور سفاح دونوں میں ....."

صـ۳۸ جصّاص کا خصاص بن گیا۔

صـ۱۲۲ :- "یعنی عورت بن جائے" یہاں لفظ "مرد" چھوٹ گیا یہیں اگلی سطر میں " دین میں تحریف" کے عوض " دین تحریف" چھپ گیا۔

صـ۱۳۷ : ترجمہ میں لفظ " ایمان" چھوٹ گیا (بے شک جو لوگ لائے پھر کافر ہوگئے)

ص۱۵۱: "انھیں کڑک تجلی نے آپکڑا" غالباً یوں ہوگا
کہ انھیں تجلی کی کڑک نے آپکڑا۔
ص۱۳۴: آیت نمبر ۱۵ اپر نمبر ۸۰ چھپ گیا۔
صفحہ ۳۶۰ پر نمبر صفحہ ۵۶۰ لکھا گیا۔
ص۶۵۷ پر دو آیتوں پر ایک ہی نمبر ۲۸ چھپ گیا جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ آیت نمبر ۹۳ تک غلطی چلتی رہی پھر نمبر ۹۰ غائب
کرکے آگے کا شمار درست کیا گیا۔

اس نوع کی طباعتی اغلاط ناشر اگر چاہیں گے تو
اگلے ایڈیشن کے وقت خود ہی تلاش کریں گے ہم کہاں تک ان
کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ ہیں بہرحال ایسی غلطیاں کافی۔

اب ہم اس جلد کی پہلی سورت النساء کے ترجمے پر اپنا
حاصلِ مطالعہ پیش کرتے ہیں ظاہر ہے کہ مولانا دریا بادی جیسے
اساتذہ کے یہاں معمولی نوع کے اسقام تو کیوں ہونے لگے۔ ان
کے سامنے اعلیٰ درجہ کی تفسیریں ہیں پھر حکیم الامت کا ترجمہ۔ ایسی صورت
میں ان کا اپنا ترجمہ جتنا بھی بہتر ہو ہونا ہی چاہیئے۔ اور خصوصاً
اردو کا روزمرہ تو ان کے ایوانِ ادب و انشاء کا دربان ہے
دل میں چھبنے والے فقرے کوئی ان سے سیکھے۔ ہماری ایک غلط فہمی
بھی ان کے ترجمے سے دور ہوئی۔ ہم اب تک یہ سمجھے ہوئے تھے
کہ بریکٹ میں جو الفاظ دیئے جاتے ہیں وہ متن کے کسی لفظ کی
ایسی تشریح ہوتے ہیں جسے اگر حذف کر دیا جائے تو فقرہ اپنی
جگہ پر تام رہے۔ لیکن ممدوح نے بکثرت ایسے بریکٹ استعمال
فرمائے ہیں جو اصل عبارت کا عین جزو ہیں اور انھیں حذف
کر دیجئے تو عبارت ہی مہمل اور ناقص ہو کر رہ جاتی ہے۔ ظاہر
ہے کہ زبان کے معاملہ میں ان کا مرتبہ سند کا ہے لہٰذا غلطی
ہماری ہی ہوگی۔

(۱) سورۂ نساء کا پہلا ہی فقرہ ہے یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا
رَبَّكُمْ۔ اس کا ترجمہ ممدوح نے یہ کیا ہے۔

"اے لوگو اپنے پروردگار سے تقویٰ اختیار کرو"

ظاہر ہے کہ ترجمہ بالکل درست ہے لیکن تعجب اس پر ہے
کہ بہترین بامحاورہ اور سلیس روزمرہ لکھنے والے مفسر ایسا ترجمہ
کریں جو بجائے خود ترجمے کا محتاج ہو۔ تقویٰ اختیار کرنا اہلِ علم
تو جانتے ہیں کہ کیا معنے رکھتا ہے۔ مگر عام آدمی اس کا مفہوم
صحیح طور پر نہیں جانتا لہٰذا کیوں نہ وہی عام فہم ترجمہ کیا جاتا
جو مولانا اشرف علیؒ، حضرت شیخ الہندؒ، شاہ عبدالقادرؒ، اور
مولانا مودودی نے کیا ہے۔ یعنی "اپنے پروردگار سے ڈرو۔ یا ڈرتے
رہو" یہ ترجمہ صحیح ہونے کے ساتھ بے نیاز شرح بھی ہے اسی
آیت میں دوبارہ واتقوا اللہ آیا تو اس کا بھی ترجمہ ممدوح نے
"تقویٰ" ہی سے کیا حالانکہ متذکرہ چاروں بزرگوں نے یہاں
بھی وہی عام فہم "ڈر" والا ترجمہ کیا ہے۔

(۲) دوسری آیت وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ کا ترجمہ
کیا گیا۔

"اور یتیموں کو ان کا مال پہنچا دو"

بے شک مولانا اشرف علیؒ نے بھی آتوا کا ترجمہ "پہنچاتے رہو"
کیا ہے لیکن دیکھنے کی بات شخصیات سے بلند ہو کر یہ ہے کہ قرآن
یہاں کہہ کیا رہا ہے۔ قرآن کا خطاب ان لوگوں سے ہے جو
کچھ یتیموں کے ولی و سرپرست بن گئے ہیں اس کا اعتراف خود
حضرت مفسر کو بھی ہے اور دوسرے مفسرین کو بھی۔ پھر لفظ "پہنچانے"
کا یہاں کیا موقع۔ یہ لفظ اردو میں اس وقت بولتے ہیں جب
درمیان میں زمانی یا مکانی یا اعتباری فاصلہ حائل ہو۔ الف زید کو
دس روپے دے کر کہتا ہے کہ یہ جیم کو پہنچا دو۔ تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ
جیم قریب موجود نہیں ہے۔ قریب موجود ہوتا تو الف یوں کہتا کہ "جیم
کو دے دو"

یتامیٰ سرپرستوں کے پاس ہی پرورش پا رہے ہیں اور آگے
پانچویں آیت (وابتلوا الیتمٰی) تو اس پر نص ہے کہ وہ ان
سے جدا اور دور نہیں ہیں۔ لہٰذا ہمارے خیال میں وہ ترجمہ زیادہ صحیح
ہے جو حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند اور مولانا مودودی
نے کیا ہے یعنی پہنچانا نہیں بلکہ "دینا" (یتیموں کا مال انھیں دیدو)

---

(۳) پانچویں آیت وابتلوا الیتمٰی الآیۃ کا ترجمہ کیا گیا

"اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو یہاں تک کہ
وہ عمر نکاح کو پہنچ جائیں۔ تو اگر تم ان میں ہوشیاری

"دیکھ لو تو ان کے حوالے ان کا مال کر دو۔"

جانچ کا لفظ محلِ غور ہے۔ ابتلا بے شک جانچنے اور آزمانے کو کہتے ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ مولانا اشرف علی اور مولانا مودودی نے آزمانے ہی کا لفظ استعمال کیا ہے مگر سوال یہ ہے کہ جانچ یا آزمائش کا ابھی موقع کیا۔ جانچا کسی شئے کو اس وقت جاتا ہے جب جانچ کے نتیجہ میں کوئی قدم اٹھانا ہو یتیموں کو ان کے بالغ ہونے سے قبل تو مال حوالے کرنا ہی نہیں ہے لہٰذا قبل بلوغ جانچنا یا آزمانا بظاہر کوئی حاصل نہیں رکھتا۔ جانچنے کا مفہوم تو دراصل اگلے فقرے فَاِنْ آنَسْتُمْ میں پوشیدہ ہے۔ یعنی جب وہ بالغ ہوجائیں تب جانچ پرکھ لیا کرو کہ ان میں اتنی ہوشیاری آگئی یا نہیں کہ مال کو سلیقے اور انتظام کے ساتھ استعمال کرسکیں اگر آگئی ہو تو ان کا مال انھیں دے دو۔

شاید یہی باریکی ہے جس کے پیشِ نظر حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ یہ کیا۔

"اور سدھاتے رہو یتیموں کو۔"

حالانکہ حضرت شیخ الہندؒ شاہ عبدالقادر کو اردو ترجمے کا "بانی اور امام" مانتے ہیں اور ان سے انتہائی عقیدت رکھتے ہیں لیکن یہاں انھوں نے شاہ صاحب کی پیروی چھوڑ کر "سدھانے" کا لفظ اختیار کیا جو ہماری فہم ناقص کی حد تک بہت برمحل ہے۔ منشائے قرآنی ان شاء اللہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک یتیم بالغ نہ ہوں ان کی اچھی طرح تربیت کرتے رہو۔ انھیں سدھاؤ اور سُدھار۔ "سدھانے" کے بامحاورہ لفظ میں وہ سب طریقے بھی آگئے جو آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً ولی نے کچھ روپیہ دیکر کہا کہ جاؤ اس کا فلاں مال خرید کر فروخت کرو۔ یتیم نے تعمیل کی۔ اب ولی نے جائزہ لیا کہ خریدنے اور فروخت کرنے میں یتیم نے سمجھداری اور سلیقے کا ثبوت دیا یا ناسمجھی اور پھوہڑپن کا۔ یہ ہے تو جانچ اور آزمائش ہی لیکن موجودہ مرحلے میں یہ سدھانے اور تربیت دینے کے زمرے میں آتی ہے۔ ویسے ابتلاء کے معنے جہاں امتحان اور جانچ پرکھ کے ہیں وہیں اختبار کے بھی ہیں۔ خبر گیری، خبرداری، نگہداشت وغیرہ۔ یہ سب "سدھانے" کے متعلقات ہیں لہٰذا ہماری ناقص رائے میں حضرت شیخ الہندؒ کا ترجمہ نفیس اور اعلیٰ ہے "جانچنے" کا محل نہیں ہے۔

(۴) آیت نمبر ۹ میں وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا کا ترجمہ کیا گیا۔

"اور بات پکی کہیں۔"

ہماری ناقص رائے میں یہاں لفظ "پکی" اکھڑا ہوا ہے۔ قرآن ہدایت یہ دے رہا ہے کہ یتیموں سے ایسی بات نہ کہو جس سے ان کا دل ٹوٹے۔ انھیں رنج پہنچے۔ ان میں اشتعال اور بگاڑ پیدا ہو بلکہ اچھی اور بھلی اور دلداری پر مشتمل بات کہو اور نہ بھولو کہ ایسا وقت تمہارے بچوں پر بھی آسکتا ہے کہ وہ یتیم رہ جائیں۔

کیا یہ مفہوم لفظ پکی سے ادا ہوجاتا ہے۔ تفسیر میں ممدوح نے "سچی اور صحیح بات" تحریر فرمایا۔ غالباً یہ بھی مناسب ترین ترجمانی نہیں۔ یہاں نہ تو جھوٹ اور غلط کا سوال ہے نہ کچی پکی باتوں کا۔ "پکی" بات محاورے میں یقینی بات کو کہتے ہیں۔ آیت کو اس مفہوم سے مناسبت نہیں۔ شاید اسی لئے شاہ عبدالقادرؒ نے "سیدھی اور اچھی بات" لکھا۔ مولانا اشرف علیؒ نے "موقع کی بات"۔ حضرت شیخ الہندؒ نے "سیدھی بات" اور مولانا مودودی نے "راستی کی بات"۔ "راستی" بھی ٹھیک نہ ہوتا اگر اس کے معنی صرف "سچی بات" کے آیا کرتے۔ لیکن محاورے میں "راستی سے بات کرنا"، نرمی اور معقولیت کے ساتھ بات کرنے کو کہتے ہیں اس لئے اس میں اور تینوں بزرگوں کے ترجمے میں کچھ فرق نہ ہوا البتہ "پکی بات" اس سے کچھ ہٹ گئی۔ (واللہ اعلم)

(۵) دسویں آیت میں وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

"اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔"

یہاں ایک لطیف نحوی بحث ہے يَصْلَوْنَ کا لفظ قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اور ہر جگہ معروف ہی ہے نہ کہ مجہول۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کیا حضرت شیخ الہند کیا حضرت حکیم الامت اور کیا مولانا مودودی کسی نے بھی یہ اہتمام ضروری نہیں سمجھا کہ ہر جگہ ترجمہ بھی معروف ہی کا کیا جائے بلکہ حضرت مفسر دریابادی مدظلہ نے یہاں مجہول کا ترجمہ کر دیا ہے اسی طرح ان بزرگوں نے بھی کہیں کہیں

یہی روش اختیار فرمائی ہے البتہ صرف شاہ عبدالقادرؒ ایسے نظر آتے ہیں جنھوں نے تمام مقامات پر اس نحوی پہلو کا لحاظ فرمایا اور جملہ مقامات پر صیغے کے مطابق معروف ہی ترجمہ کرتے چلے گئے (آگ میں گھسیں گے۔ آگ میں داخل ہوں گے)

یہاں زیرِ تذکرہ مقام پر شاہ صاحب، حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا اشرف علی معروف ہی ترجمہ کرتے ہیں لیکن حضرت مفسر نے مجہول کیا اور مولانا مودودی ان کے ساتھ ہیں۔ ہم نے تجسس کیا کہ آخر ایسا کیوں۔ حاصلِ تجسس کوئی خاص نہیں نکلا۔ بس اتنا پتہ چل سکا قرّاءِ سلف میں سے بعض قرّاء مثلاً ابن عامر، ابوبکر اور عاصم رحمہم اللہ اس کی قرأت بصیغۂ مجہول کرتے ہیں (یُصلَون)، لیکن پھر اور بھی متعدد مقامات پر یہ نظر آیا کہ بعض اور الفاظ قرآنی کے ترجمے میں یہی نحوی فرق پایا جا رہا ہے مثلاً سورۂ مائدہ کے شروع ہی میں ہے حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ اور اُحِلَّ لَكُمُ دو بار۔ یہ مجہول صیغے ہیں لیکن حضرت شیخ الہند کے یہاں ان کا ترجمہ بصیغۂ معروف ملتا ہے (حلال ہیں اور حلال ہوئیں)، حالانکہ یہ ترجمہ نحوی اعتبار سے حَلَّ لَكُمْ کا ہونا چاہیئے نہ کہ ان صیغوں کا۔

یا مثلاً سورۂ اعراف کی آیت ۱۹۱ میں حضرت شیخ الہندؒ نے وَهُمْ يُخْلَقُونَ کا ترجمہ کیا ہے" اور وہ پیدا ہوئے ہیں" حالانکہ صیغے کی مناسبت سے صحیح ترین ترجمہ وہی ہوگا جو شاہ صاحب اور حکیم الامت اور مولانا مودودی نے کیا یعنی" وہ پیدا کئے گئے ہیں"۔

اسی طرح سورۂ اعراف کی آیت ۱۲۰ میں وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ کا ترجمہ شیخ الہند نے یہ کیا" اور گر پڑے جادوگر سجدے میں" مولانا اشرف علی نے یہ کیا" اور وہ جو ساحر تھے سجدے میں گر گئے"۔ یہ دونوں ترجمے ظاہر ہے معروف ہیں جبکہ اُلْقِيَ صیغۂ مجہول ہے۔ چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ اور مولانا مودودی نے مجہول ہی ترجمہ کیا ہے جو نحوی اعتبار سے زیادہ مطابق بالقرآن ہے۔

اسی طرح سورۂ اعراف آیت ۲۹ میں تَعُودُونَ کا ترجمہ مولانا مودودی نے" پیدا کئے جاؤ گے" کیا۔ اور شاہ صاحب نے بھی یہی لیکن یہ ترجمہ مجہول ہے جبکہ لفظ قرآنی معروف۔ لہٰذا زیادہ اقرب و اولیٰ ترجمہ یہاں مولانا اشرف علی اور شیخ الہند کا ہے (دوبارہ پیدا ہوگے۔ دوسری بار بھی پیدا ہوگے)

اس طرح کی باریکیاں دراصل یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کوئی کتنا ہی بڑا عالم اور شیخ ہو مگر اس کے کام میں کہیں نہ کہیں کوئی شکن کوئی زَلّت کوئی داغ کوئی دھبہ رہ ہی جاتا ہے۔ یہ بشریت کا ناگزیر تقاضا ہے اور خدا کے بعد بس انبیا ہی کی شان ہے کہ ان کے کلام وحی نظام کو کامل و اکمل تصور کیا جائے۔ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔

---

(۶) ۲۴ ویں آیت کے ایک ٹکڑے اَنْ تَبْتَغُوا بِاَمْوَالِكُمْ کا ترجمہ یہ کیا گیا۔

" اور جو (عورتیں)، ان کے علاوہ ہیں وہ
تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۔ یعنی انھیں اپنے مال
کے ذریعہ تلاش کرو"

ہمارا ناقص خیال ہے کہ لفظ" تلاش" یہاں بامحاورہ نہیں ہے۔ جن چار بزرگوں کے ترجمے اس وقت ہمارے سامنے ہیں ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ مہر کے بدلے عورت سے نکاح کرنے کو چاہنا، طلب کرنا، حاصل کرنا تو کہہ سکتے ہیں چنانچہ یہی الفاظ چاروں بزرگوں نے استعمال فرمائے ہیں مگر تلاش کرنا بے محل معلوم ہوتا ہے۔

پیسے کے ذریعہ سب کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یا
ہر خواہش پوری کی جا سکتی ہے۔ یا ہر مطلوبہ شے
مل سکتی ہے۔

یوں تو بولتے ہیں مگر یوں نہیں بولتے کہ" پیسے کے ذریعہ ہر چیز تلاش کی جا سکتی ہے"

یہاں سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت بھی زیرِ غور لے آئی جائے وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ یہاں بھی ٹھیک وہی ابتغاء موجود ہے۔ شیخ الہند نے ترجمہ کیا۔

" اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور
کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا"

شاہ عبدالقادر بھی یہی" چاہے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مولانا اشرف علی نے لفظ" طلب" لکھا ہے اور مولانا مودودی" اختیار کرنا" لکھتے ہیں۔" تلاش" کسی نے نہیں لکھا۔ ہاں

یہی مادہ (بغی) جب فعل لازم میں چند آیات پہلے استعمال ہوا (افغیر دین اللہ یبغون) تو حضرت شاہ صاحب اور حضرت شیخ الہند دونوں نے "ڈھونڈتے" کا لفظ استعمال کیا جو "تلاش" کے مرادف ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ ابتغاء کے معنی تلاش کرنے کے نہیں آتے بلکہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ زیر بحث آیت میں یہ لفظ اردو روزمرہ سے مطابقت نہیں رکھتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

زبان دانی میں ہمارا مقام ہی کیا لہٰذا یہ بس ایک اناڑی کی رائے ہے جو ضروری نہیں کہ درست ہی ہو۔

---

(۷) ۳۱ ویں آیت ان تجتنبوا کبائر کا ترجمہ کیا گیا۔ "اگر تم ان بڑے کاموں سے جو تمہیں منع کئے گئے بچتے رہو"

تعجب ہے مفسر ممدوح نے کبائر کا ترجمہ "بڑے کام" رہنے دیا حالانکہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ لفظ "سیئات" کا ترجمہ ہے۔ مولانا اشرف علیؒ نے "بھاری بھاری کام" لکھے ہیں۔ شاہ صاحب "بڑے گناہ" شیخ الہند بڑے کی صفت کو نظر انداز نہیں کرتے اور مولانا مودودی "بڑے بڑے گناہ" لکھتے ہیں جو سب سے زیادہ برمحل ہے۔ پھر ممدوح کیوں بغیر کسی وصفی لفظ کے "برے" پر اکتفا کر گئے۔ "برے" تو صغائر بھی ہوتے ہیں "کبائر" کی کیا تخصیص۔ یہ بجا ہے کہ تفسیری نوٹ میں انھوں نے "بڑے بڑے گناہ" لکھدیا ہے لیکن یہ الفاظ تو عین ترجمے میں آنے کے تھے کیونکہ ان کی حیثیت تفسیر کی نہیں منطوقِ کلام اور "نص" کی ہے۔

(جاری)

درسِ قرآن

آسان زبان میں قرآن سمجھنے کا بہترین سلسلہ

اردو میں یوں تو اللہ کے فضل و کرم سے ایک سے ایک تفسیریں موجود ہیں لیکن ان کی علمی سطح کافی بلند ہے اس لئے ضرورت تھی کہ ایک ایسی تفسیر سامنے آئے جو علمی اعتبار سے تو مستند ہو لیکن زبان اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بالکل عام فہم ہو جس سے عورتیں اور نوجوان بچے اور کم پڑھے لکھے مرد بھی فائدہ اٹھا سکیں یہ تفسیر جس کا نام "درسِ قرآن" ہے ایسی ہی تفسیر ہے۔ اصلاً یہ مولانا اشرف علیؒ کی تفسیر ہے اور حواشی مولانا ظفیر احمد استاذ دارالعلوم دیوبند کے ہیں۔ لیکن زبان کو نہایت آسان کر دیا گیا ہے۔

یہ تفسیر مکمل موجود ہے جس کی مجموعی قیمت ڈیڑھ سو روپے ۱۵۰/ ہوتی ہے لیکن عام لوگوں کی آسانی کے لئے ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ دس جلدیں الگ الگ بندھوا لی ہیں اور فی جلد بجائے پندرہ روپے ۱۵/ کے بارہ روپے ۱۲/ میں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

مزید رعایت: آپ دو روپے ۲/ بھیجکر ممبر بن جائیں تو ڈاک خرچ بھی آپ کو معاف ہوگا اور ہر مہینے ایک جلد صرف بارہ ۱۲/ روپے کے وی پی سے آپکو بھیجدی جائیگی۔ اور اگر آپ مالی گنجائش کی کمی کے باعث یہ چاہیں کہ ہر جلد دو مہینے بعد بھیجی جائے تو ایسا بھی کر لیا جائے گا۔

گویا دو روپئے ۲/ فیس ممبری داخل کرنے کے بعد یہ ڈیڑھ سو روپے ۱۵۰/ قیمت کی مکمل تفسیر آپ کو صرف ایک سو بیس روپئے ۱۲۰/ میں مل جائیگی اور دس جلدیں مفت رہیں اور رقم بھی آسان قسطوں میں ادا ہو گئی۔ جو لوگ مکمل تفسیر ایک ہی وقت میں لینا چاہیں انھیں فیس ممبری کے بغیر ہی ایک سو بیس روپے ۱۲۰/ میں دے دی جائے گی۔ البتہ اپنا ریلوے اسٹیشن ضرور لکھیں، کرایہ ریل ہمارے ذمہ ہوگا) اس رعایت سے فوری فائدہ اٹھائیں۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے ۲ مارچ ۷۳ء
کو دفتر جماعت (لاہور) میں کارکنوں کے بہت بڑے اجتماع سے خطاب کیا
ذیل میں اس کا مکمل متن ملاحظہ فرمائیے۔

کارکنوں سے مولانا مودودی کا خطاب[1]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمد و ثنا کے بعد

حضرات!

جماعتِ اسلامی کی آئین پسندی اور اس کے احترام قانون کا یہ ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایسے موقع پر جو جماعت کے لوگوں ہی کے لئے نہیں اور اس سے ہمدردی رکھنے والوں ہی کے لئے نہیں بلکہ عام شریف آدمیوں کے لئے بھی انتہائی اشتعال انگیز موقع تھا اور جب کہ ان کے دلوں میں غم و غصّے کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں۔ انھوں نے پورے صبر و ضبط سے کام لیا اور اس وقت تک کسی شخص نے قانون کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا حکومت کی طرف سے جب عام جلسے کی اجازت نہیں دی گئی تو اس چار دیواری کے اندر یہ اجتماع منعقد کیا جا رہا ہے تاکہ قانون کے اندر رہ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جائے۔ اس کے باوجود اگر ایسی جماعت کے متعلق کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ فساد پسند ہے اور ملک کے نظم و قانون کو نقصان پہنچانا چاہتی ہے تو وہ اپنی کذب بیانی کا ثبوت خود ہی فراہم کرتا ہے۔

میری قید کے دوران

میاں طفیل محمد صاحب کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے وہ اس سے پہلے کسی حکومت کے زمانے میں بھی خواہ پاکستان کی حکومت ہو یا پاکستان سے پہلے کی حکومت، کسی پارٹی کے لیڈر کے ساتھ نہیں کیا گیا۔ انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بڑی بڑی پارٹیوں کے لیڈر گرفتار ہوتے رہے ہیں، لیکن ان کے ساتھ ہمیشہ احترام کا برتاؤ کیا گیا۔ ان کو قید کرنے کا مقصد ان کے کام کو روکنا ہوتا تھا۔ ان کو ذلیل کرنا، ان کی توہین کرنا اور ان کو اذیت دینا مقصود نہ ہوتا تھا۔ پاکستان میں خود میں کئی مرتبہ گرفتار ہوا ہوں۔ سب سے پہلے ۱۹۴۸ء میں مجھے نظر بند کیا گیا اور ۲۰ مہینوں تک نظر بند رکھا گیا مگر پولیس کا تھانہ ہو یا جیل، دونوں جگہ لوگوں نے میرے ساتھ انتہائی احترام کا برتاؤ کیا، تہذیب و شرافت کا برتاؤ کیا۔ اس زمانے میں جو

لہ امیر جماعتِ اسلامی پاکستان۔

لوگ جیل کے حکّام تھے ان سے آج تک میرے اور میرے ساتھ نظر بند ہونے والوں کے دوستانہ تعلقات چلے آتے ہیں انھوں نے کوئی حرکت ایسی نہیں کی جس کی وجہ سے ہماری رہائی کے بعد وہ ہمارے سامنے آنکھیں نہ اٹھا سکتے ہوں یا ہم سے شرمندہ ہوں۔

دوسری بار ۱۹۵۳ء میں مجھے مارشل لا کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اس وقت فوج اور پولیس دونوں سے مجھے سابقہ پیش آیا، لیکن فوج اور پولیس دونوں نے میرے ساتھ انتہائی احترام کا برتاؤ کیا۔ مجھے شاہی قلعہ میں بھی لے جایا گیا جو اپنی اذیت رسانی کی وجہ سے بہت بدنام ہے، لیکن جب فوج مجھے قلعے لے جانے کیلئے آئی اور میں پرانی جیل کے دیوانی احاطے سے باہر نکل کر آیا تو فوج کے سپاہی اور افسر احتراماً اپنے ٹرک سے نیچے اُتر کر کھڑے ہو گئے اور میرے بیٹھنے کے بعد خود بیٹھے اُس قلعے میں جو اپنی اذیت رسانیوں کے لئے بدنام ہے میرے ساتھ کوئی ایسی بات نہ کی گئی جس میں ذرا سی بدتمیزی یا بدتہذیبی پائی جاتی ہو۔ اس زمانے میں جو لوگ قلعے کے افسر تھے ان میں سے بھی بعض بعد میں مجھ سے ملے ہیں اور انھیں کوئی شرمندگی نہ ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے کوئی ایسی کارروائی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ شرم کے مارے میرے سامنے نہ آسکتے ہوں۔

مجھے فوجی عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور اس نے میرے لئے موت کی سزا تجویز کی۔ بعد میں جب میں رہا ہوا تو اسی فوجی عدالت کے ایک ممبر جو فوج سے الگ ہو چکے تھے، میرے پاس میرے گھر مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور انھوں نے کہا خدا کی قسم آپ کی موت کا حکم ہم نے نہیں لکھا تھا، اوپر سے ہم پر القا کیا گیا تھا اور ہمیں اپنی نوکریوں کی وجہ سے اسے مجبوراً نافذ کرنا پڑا۔

میری سزائے موت جب عمر قید میں تبدیل ہوئی اور مجھے جیل میں رکھا گیا تو میرے لئے "سی" کلاس تجویز کی گئی تھی جیل کے حکام نے مجھ سے کہا کہ آپ صرف اتنا لکھ دیں کہ آپ کو بہتر کلاس دی جائے، لیکن میں نے کہا کہ اگر آپ کے پاس کوئی "ڈی" کلاس ہے تو مجھے اس میں رکھیں، میں ظالموں سے کوئی رعایت بھی طلب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اس کے بعد کوئی زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ میری کلاس خود بخود تبدیل کر دی گئی اور مجھے "بی" کلاس دیدی گئی۔

میرے لئے مشقت کی سزا بھی تجویز کی گئی تھی، لیکن جب میں مشقت کرنے یعنی سوت کاتنے کے لئے بیٹھا تو تمام قیدی دوڑ پڑے اور کہا کہ ہم آپ کو مشقت نہیں کرنے دیں گے آپ کی مشقت ہم کریں گے اس کے بعد سے جب تک جیل میں رہا کسی نے میرے سامنے مشقت کا نام تک نہیں لیا۔ اس زمانے میں بھی جیل کے حکام نے میرے ساتھ شرافت کا برتاؤ کیا اور ان کے ساتھ اب تک میرے دوستانہ تعلقات چلے آ رہے ہیں۔ میری رہائی کے بعد سے آج تک ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھ سے ملنے کے لئے آتا رہتا ہے۔ یہ سکندر مرزا اور غلام محمد کا زمانہ تھا جو اپنے اعمال کے لئے بہت بدنام ہیں مگر ان میں بھی اتنی آدمیت تھی کہ وہ جانتے تھے کہ کس پارٹی کے لیڈر کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔

اس کے بعد ایوب خاں کا دور آیا۔ اس دور میں بھی میں دو مرتبہ جیل گیا۔ دونوں مرتبہ میرے ساتھ جیل میں انتہائی شرافت، تہذیب اور ادب و احترام کا سلوک کیا گیا۔ میرے ساتھ جیل میں کوئی ایسا سلوک نہیں کیا گیا جسے تہذیب و شرافت سے گرا ہوا قرار دیا جا سکے۔ اس زمانے میں جو لوگ جیل کے حکام تھے وہ بھی مجھ سے بعد میں ملتے رہے ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض کے بیٹے بھی میرے پاس ملنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ ایوب خاں کا زمانہ تھا جس پر ملامت کی بوچھاڑ کی جاتی ہے مگر اس زمانے میں بھی یہ تمیز موجود تھی کہ کس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔

یہ "جاندار مخلوق"

اب ان لوگوں کا دور آیا جن کا دعویٰ ہے کہ وہ "عوامی لیڈر" ہیں اور انھیں "عوام" نے منتخب کیا ہے۔ ان لوگوں نے انگریزوں سے لے کر سکندر مرزا، غلام محمد اور ایوب خاں تک کے مظالم کو مات کر دیا۔ انھوں نے جماعت اسلامی کے

سب سے بڑے لیڈر کو جیل میں اذیت پہنچائی، اسکی توہین کی اور اس کی تذلیل سے لذت حاصل کی۔

یہ فعل صرف دو صورتوں ہی میں ممکن ہوسکتا ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اوپر سے اس کام کا اشارہ کیا گیا ہو۔ اگر واقعی صدر صاحب یا گورنر صاحب کی طرف سے ایسا اشارہ کیا گیا ہے تو میں ان سے کہوں گا کہ حضرات سیاست میں لڑائی بھی ہوتی ہے اور دوستی بھی ہوا کرتی ہے۔ دونوں حالتوں میں ان کو آدمیت کے دائرے میں رہنا چاہیئے۔ لڑتے ہو تو لڑو لیکن بھلے انسانوں کی طرح لڑو۔ ایسا نہ ہو کہ کل حکومت جب تمھارے ہاتھ سے نکل جائے تو تم ہمیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہو۔

اگر ماتحت عملے نے یہ کام کیا ہے تو میں کہتا ہوں کہ وہ "جاندار مخلوق" جس کو جیل کا سپرنٹنڈنٹ بنایا گیا ہے، اس کی گوشمالی کرنی چاہیئے۔ اس کی حرکت کی وجہ سے پاکستان کی بدنامی پوری دنیا میں ہوئی ہے۔ جماعت اسلامی کے اثرات پاکستان تک محدود نہیں ہیں بلکہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جنوبی افریقہ سے یورپ تک، انڈونیشیا سے مراکش تک اور مراکش سے امریکہ تک اس کا اثر وسیع ہے ساری دنیا تک یہ بات پہنچ چکی ہے کہ جماعتِ اسلامی کے لیڈر کے ساتھ جیل میں کیا سلوک کیا گیا ہے اور دنیا بھر سے اس حرکت پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ جس شخص نے اپنی نادانی، جہالت اور بدتمیزی سے پاکستان کی بدنامی کا یہ سامان کیا ہے اسکی اچھی طرح گوشمالی ہونی چاہیئے وہ وارڈر بننے کے قابل بھی نہیں۔ چہ جائیکہ اسے سپرنٹنڈنٹ بنا کر رکھا جائے۔ وہ کسی ذمہ دارانہ عہدے پر رکھے جانے کے لائق نہیں ہے۔ حکومت کی پیشانی پر ایسے عہدہ دار کلنک کا ٹیکہ ہیں۔

لڑائی — اپنے تجویز کردہ میدان میں

اب میں جماعتِ اسلامی کے کارکنوں سے بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ اگر اپنے مقاصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو دو صفات اپنے اندر پیدا کر لیجئے۔ ایک صفت تو یہ ہے کہ مخالف اگر آپ کو مشتعل کر کے فائدہ اٹھانا چاہے تو مشتعل ہونے سے انکار کر دیجئے۔ فوج میں اس جنرل سے زیادہ نالائق کوئی جنرل نہیں سمجھا جاتا جو دشمن کے تجویز کردہ میدان میں لڑنے کے لئے جا کھڑا ہو اسے اپنے تجویز کردہ میدان میں دشمن کو لاکر لڑنا چاہیئے۔ اسی طرح آپ کو بھی اتنا صبر اور ضبطِ نفس اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے کہ آپ کا مخالف جب آپ کو مشتعل کر کے لڑائی پر اکسائے اس وقت آپ مشتعل ہوکر کوئی ایسا کام نہ کریں جو اس کا مقصد پورا کرتا ہو۔ دوسری صفت یہ ہے کہ حالات خواہ کیسے ہی سخت ہوں، اپنے موقف سے آپ کسی طرح پیچھے نہ ہٹیں چاہے آپ پر لاٹھیاں برسائی جائیں یا گولیاں یا جیلوں میں آپ کو اذیت دی جائے۔ جو ظلم بھی ہو اسے ہمت کے ساتھ برداشت کیجئے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہیئے اور اس سے کسی قیمت پر پیچھے نہ ہٹیئے صبر و حکمت اور نظم وضبط اور دانشمندی کے ساتھ عمل کرنا اور مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہنا کامیابی کیلئے شرط لازم ہے۔ اگر آپ دانشمندی سے کام لیں اور کوئی آپکو دبانا چاہے تو آپ دھوکا نہ کھائیں تو کوئی جتنی چاہے آپ کی مخالفت کرکے دیکھ لے آخر کار کامیابی آپ ہی کی ہوگی اور کوئی آپ کو شکست نہ دے سکے گا۔

اس کے بعد میں ملک کے حالات کے متعلق بھی کچھ باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ہم نے بھٹو صاحب سے کہا

صدر بھٹو جب صدارت کے منصب پر آئے تو اسی وقت ہم نے واضح طور پر ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ چونکہ اکثریت میں ہیں اس لئے حکومت کرنے کا آپ کو حق ہے۔ مگر آپ کو انصاف کے ساتھ حکومت کرنی چاہیئے اور ہم چونکہ آپ کی پارٹی کے آدمی نہیں ہیں ایک اپوزیشن پارٹی ہیں اس لئے آپ حزبِ اختلاف ہونے کی حیثیت سے ہمارا

یہ حق تسلیم کریں کہ ہم حکومت کی جس بات کو غلط سمجھیں اسے غلط کہیں اس کے خلاف آواز بلند کریں اور قانونی اور آئینی حدود کے اندر رہ کر پبلک میں کام کریں اور اگر یہ دونوں چیزیں آپ مانتے ہیں تو ہم آپ کے ساتھ ہر اس کام میں تعاون کریں گے جو ملک کی بھلائی کے لئے ہو کیونکہ اس وقت ملک کو بڑے خطرات درپیش ہیں۔ ہم سب بڑے نازک حالات سے گذر رہے ہیں اور یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں ہے۔ یہی باتیں میں نے صدر صاحب سے زبانی بھی کہی تھیں اور انھوں نے انھیں تسلیم کیا تھا۔

قول کی پابندی

جماعت نے اپنے اس قول کی پابندی کی، اس نے جو اختلاف بھی کیا دلیل سے کیا۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ جماعت نے یا اس کے کسی شخص نے یا اس کی کسی شاخ نے کہیں قانون کی خلاف ورزی کی ہو یا کبھی آئین، تہذیب اور شرافت کی حدود سے تجاوز کیا ہو یا کوئی ایسا کام کیا ہو جو فساد پھیلانے والا ہو۔ ہاں مگر اختلاف ضرور کیا ہے جو اس کا حق تھا اور ہے۔ اس کے اس حق سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جس بات کو غلط سمجھے اسے غلط کہے اور اسے درست کرنے کی کوشش کرے۔ کوئی اسے اس حق سے دستبردار ہونے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اس کا مقصد حکومت کو بدنام کرنا نہیں، بلکہ اس کو درست کرنا ہے اور راہِ راست پر لانا ہے اور اس کو اختیارات کے غلط استعمال سے روکنا ہے۔ جمہوریت اور معقولیت کے آخر وہ کون سے اصول ہیں جن کی رو سے جماعت کے اس طرزِ عمل کو بے جا کہا جاسکتا ہو؟

خلاف ورزی پر خلاف ورزی

اب ذرا دیکھئے کہ دوسری طرف سے انصاف اور جمہوری طریقوں کی پابندی کا جو اقرار کیا گیا تھا وہ کس طرح پورا کیا گیا سب سے پہلے تو "قائدِ عوام" چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے وارث بن بیٹھے اور انھوں نے مارشل لا قائم رکھنے پر اصرار کیا۔ دنیا میں کبھی کسی نے نہ سنا تھا کہ ایک شخص جمہوری طریقوں سے منتخب ہوا ہو اور وہ مارشل لا کا حاکم بننا قبول کرے اور اسے جاری رکھنے پر اصرار کرے ان سے تو یہ توقع کی جاتی تھی کہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد پہلا کام وہ یہ کریں گے کہ مارشل لا ختم کردیں گے اور جمہوریت بحال کریں گے، لیکن انھوں نے قانون کی حکومت کے بجائے لاقانونی قانون (LAWLESS LAW) کو باقی رکھا۔ یہ پہلی علامت تھی جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بھٹو صاحب جو جمہوریت کو اپنی سیاست قرار دینے کا نعرہ لگاتے تھے۔ ان کے اس نعرے کی حقیقت کیا تھی۔ انھوں نے پہلے ہی مرحلے پر ثابت کردیا کہ اس نعرے میں وہ صادق اور راست باز نہ تھے۔ کیا یہ جمہوریت ہے کہ جنرل یحییٰ کے بعد "قائدِ عوام" چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بن کر بیٹھ جائے؟

اس کے بعد انھوں نے سرکاری ملازموں کی کھیپ کو نکال باہر کیا۔ بغیر کوئی وجہ بتائے، بغیر چارج شیٹ دیئے اور بغیر کسی کارروائی کے۔ اس طرح چھوٹے ملازمین سے لیکر بڑے سے بڑے سرکاری افسروں تک کو خوف زدہ کردیا گیا کہ انھیں کسی وقت بھی کان پکڑ کر نکال باہر کیا جاسکتا ہے اور ان کی ملازمت کیلئے کسی قسم کا آئینی تحفظ اب باقی نہیں رہا ہے۔ سرکاری ملازمین کو اس طرح بیک جنبشِ قلم نکال دینا اور ملازمتوں کے لئے کسی قانونی اور آئینی تحفظ کو باقی نہ رکھنا آمریت کی راہ کا پہلا قدم اور اس کو قائم رکھنے کا سب سے مجرب نسخہ ہے۔ جو شخص بھی آمریت قائم کرنا چاہتا ہے وہ سب سے پہلے حکومت کا نظم و نسق چلانے والے کارکنوں کو خوف زدہ کرتا ہے اور ان کو خبردار کردیتا ہے کہ وہ نظامِ حکومت کے نہیں، بلکہ آمر کے ملازم ہیں، اس کی مرضی کے خلاف وہ ذرا سی جنبش بھی کریں گے تو وہ جب چاہے ان کو کان پکڑ کر نکال سکتا ہے۔ اس کے بعد بیچارے سرکاری ملازمین سے جو کام بھی چاہے لیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد جو ذلیل سے ذلیل اور کمینہ سے کمینہ اور غلط سے غلط کام بھی لیا جائے اسے وہ بے چون و چرا کریں گے تاکہ نوکری سے نکال نہ دیئے جائیں۔ وہ آمر کے ہاتھ میں ایک بے جان اور بے ضمیر لاٹھی کی طرح ہوں گے اور نظم و نسق کی پوری مشینری آمر کی مٹھی میں ہوگی

جس سے وہ عوام کو دبانے کا ہر کام لے سکے گا خواہ وہ قانون کے مطابق ہو یا اس کے خلاف۔ اس غلط اقدام پر اب تک اصرار کیا جارہا ہے اور ملازمین کے لئے کوئی تحفظ (SECURITY OF SERVICE) زیر تجویز آئین میں نہیں رکھا جارہا ہے۔

ملازمین کو قابو میں لانے کے ساتھ ساتھ صحافت کا گلا بھی گھونٹ دیا گیا۔ اس کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار یہ ہے کہ نیوز پرنٹ کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیا گیا ہے تاکہ جس اخبار کو چاہیں پنپنے دیں اور جس کو چاہیں دبا کر یا تو تابع فرمان بنالیں یا ختم کردیں۔ صرف نیوز پرنٹ کنٹرول ہی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اخبارات بند کر دیئے گئے، ان سے بھاری ضمانتیں لی گئیں۔ ایڈیٹروں کو قید کیا گیا اور پریس پر دوسری بہت سی پابندیاں بھی لگادی گئیں۔ یہ جمہوریت پر کاری ضرب ہوتی ہے کہ آزاد پریس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور اپوزیشن کی کسی آواز کو بلند نہ ہونے دیا جائے۔ اگر ملک میں آزاد پریس باقی نہ رہے تو جمہوریت کے پاس وہ ہتھیار ہی نہیں رہتا جس سے اس کا وجود باقی رہ سکتا ہو۔

نیشنل ٹرسٹ کو ختم کرنے کا مطالبہ خود مسٹر بھٹو نے بڑے زور شور سے اٹھایا تھا اور انتخابات کے زمانے میں وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو توڑ دیں گے، لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد انھوں نے خود اس خنجر کو اپنے ہاتھ میں لے لیا* حالانکہ ایوب خاں کے دور میں جب خود بھٹو صاحب کے خلاف یہ نیشنل پریس ٹرسٹ استعمال ہوتا تھا تو وہ اس کی شکایت کرتے تھے۔ کیا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ خنجر جب ایوب خاں کے ہاتھ میں تھا تو برا تھا اور جب یہ خود بھٹو صاحب کے ہاتھ میں آگیا تو بڑا اچھا ہتھیار ہے؟

حزب اختلاف کے پاس اپنی آواز بلند کرنے کیلئے آزاد صحافت کے بعد آزاد پلیٹ فارم ہوتا ہے لیکن سارے ملک میں بے تحاشا دفعہ ۱۴۴ کا استعمال کرکے اور مظاہروں کے حق کو محدود سے محدود تر کرکے اور پُرامن مظاہروں کو بلا کسی جائز وجہ کے لاٹھی چارج اور آنسو گیس اور بعض اوقات گولیوں کا نشانہ بنا کر عملاً ختم کردیا گیا ہے۔

جمہوریت کی زندگی کے لئے آزاد تعلیم بھی ضروری ہوتی ہے۔ تمام جمہوری ممالک میں مدارس سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح تک آزاد ادارے موجود ہوتے ہیں تاکہ نئی نسل غلامی کے بجائے آزادی کا سبق سیکھے لیکن ایک طرف یونیورسٹی آرڈی ننس کے ذریعے سے سرکاری یونیورسٹیوں کو ارباب حکومت کا وابستہ دامن بنادیا گیا ہے اور دوسری طرف پبلک کے تعلیمی اداروں کو سرکاری قبضے میں لے لیا گیا ہے۔ اس کا صاف مقصد یہ ہے کہ ملک کی پوری نسل کو وہ تعلیم دی جائے جو حکومت چاہتی ہے۔ یہ تعلیم کی اصلاح نہیں ہے بلکہ نسل جدید کو آمریت کے قابو میں رکھنے کی وہ ترکیب ہے جسے (REGIMENTATION) کہا جاتا ہے۔

اب یہ لوگ ریڈیو، ٹی وی اور سرکاری اخبارات کو یک طرفہ پروپیگنڈے کیلئے استعمال کرکے عوام کو مسحور کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے کان بھریں اور جس طرف چاہیں ان کو ہانک کرلے جائیں۔ آج کل ٹی وی اور ریڈیو کو اپوزیشن اور جماعت اسلامی کے خلاف خوب استعمال کیا جارہا ہے۔ خصوصاً ٹی وی پر تو میری بڑی "خدمت" کی جارہی ہے مگر میں بھٹو صاحب سے کہتا ہوں کہ آپ کی پیدائش سے بھی دس سال پہلے سے میں پبلک لائف میں موجود ہوں۔ میری کتابیں لاکھوں کی تعداد میں گھر گھر پھیلی ہوئی ہیں۔ صرف اس ملک ہی میں نہیں، بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں برسوں سے ان کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہورہی ہے۔ آپ دس سال تک بھی یہ پروپیگنڈہ جاری رکھیں تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے بشرطیکہ آپ دس سال تک برسر اقتدار رہ سکیں۔ مجھے آپ کے اس پروپیگنڈے کی ذرہ برابر پروا نہیں، میں اس کا نوٹس تک نہیں لیتا اگر آپ کے ذرائع خبر رسانی آپ کو دھوکے میں رکھ رہے ہیں تو آپ اس پروپیگنڈے پر خوش ہولیں مگر ملک کی پڑھی لکھی آبادی

ٹی وی کے اس پروپیگنڈے کا الٹا اثر لے رہی ہے۔ اس سے متاثر تو وہ کیا ہوتی، گھر گھر لوگ اس پر نفریں بھیج رہے ہیں اور بہت سے گھروں میں ٹی وی کو اس وقت بند کر دیا جاتا ہے جب اس پر یہ پروگرام آنا شروع ہوتا ہے۔

یک طرفہ جھوٹا پروپیگنڈہ ایوب خاں نے بھی چھ سال تک اپنے حق میں اور دوسروں کے خلاف کیا تھا۔ اخبارات ریڈیو اور وسائل ابلاغ دن رات اس کام میں لگے رہے اور ہر مخالف آواز کو دبا یا گیا، لیکن جب صدارت کے انتخاب کے موقع پر محترمہ فاطمہ جناح میدان میں نکلیں تو ایوب خاں کا جھوٹا پروپیگنڈہ سارے کا سارا دم توڑ گیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ عوام پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کے دورے میں جگہ جگہ جس طرح لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے اور ان کے جلسوں میں جس طرح فوج در فوج آتے تھے، اس سے ظاہر ہو گیا کہ مسلسل چھ سال کا یہ پروپیگنڈا ہوا میں اڑ گیا۔

جھوٹے پروپیگنڈے سے کسی قوم کو اُلّو نہیں بنایا جا سکتا۔ جو لوگ قوم کو اُلّو بنانے میں سرگرم عمل ہیں۔ انکو معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی پوری قوم کو اُلّو بنانا ممکن نہیں ہوتا، کچھ لوگ بک سکتے ہیں، کچھ لوگ دھوکہ بھی کھا سکتے ہیں۔ لیکن ساری قوم نہ بک سکتی ہے اور نہ دھوکہ کھا سکتی ہے۔

آمریت قائم کرنے کے لئے ان ساری تدبیروں کے ساتھ ظلم کی چکی بھی پورے زور سے چل رہی ہے۔ سندھ میں زبان کا جھگڑا کھڑا کیا گیا اور ہمارے اوپر الزام لگایا گیا کہ یہ سب کچھ جماعت اسلامی کا کیا دھرا ہے، مگر آج ان کے اپنے ہی گورنر نے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد یہ راز فاش کر دیا ہے کہ زبان کا جھگڑا خود حکومت نے کھڑا کیا تھا، پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی ترکیب جو انھوں نے اپنے سابق استادوں سے سیکھی تھی اسے انھوں نے اپنی قوم اور اپنے ہی ملک پر استعمال کر ڈالا۔ سینکڑوں آدمیوں کو گرفتار کیا گیا ہزاروں کو گھر سے بے گھر کر دیا گیا اور آبادی کے دو طبقوں میں نفرت کا بیج بو دیا گیا، حالانکہ یہی آبادی ۲۵ برس سے سندھ میں امن کے ساتھ رہ رہی تھی۔

وہاں یہ جنگلے نہیں ہوں گے

مزدوروں کے یہ بڑے حامی بنے پھرتے تھے، مگر ان پر ایسا تشدد کیا گیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ طالبعلموں کو یہ اپنا ہراول دستہ قرار دیتے تھے، مگر ان کے ساتھ وہ ظلم کیا گیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس قدر بے رحمی سے ان پر تشدد کیا گیا کہ پچھلے سارے ریکارڈ توڑ دیئے گئے۔ کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ کسی حکومت کے دور میں پولیس نے طلبہ کو سڑکوں پر ننگا کیا ہو۔ کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ پولیس طلبہ کو صرف ننگا ہی نہ کرے، بلکہ ان کے ساتھ عمل قوم لوط بھی کرے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ پولیس کو یہ کمینہ حرکتیں کرنے کا حکم دینے والا کون تھا؟ اگر یہ حکم صدر صاحب یا گورنر صاحب نے دیا ہے تو میں ان سے کہتا ہوں کہ بھول نہ جاؤ کہ اوپر کوئی خدا بھی ہے اور ایک روز تمھیں مرنا بھی ہے اور خدا کے سامنے ایسی حالت میں کھڑا ہونا ہے کہ یہ خاردار تاروں والے جنگلے لگے ہوئے گورنمنٹ ہاؤس تمھاری حفاظت کے لئے موجود نہ ہوں گے۔ تم نے یہ ایسی حرکت کی ہے جس کی بنا پر ایک قوم خدا کے عذاب میں مبتلا ہو چکی ہے اور اس پر پتھر برسائے گئے ہیں۔ لیکن اگر یہ حکم صدر یا گورنر نے نہیں دیا تو پولیس کے جن افسروں نے اس کا حکم دیا اور جن ملازموں نے یہ کام کیا ان کو پکڑیئے اور کوڑے مار مار کر ان کی کھال اُدھیڑ دیجئے۔ پاکستان کے بچے ایک شریف قوم کے بچے ہیں۔ وہ اس لئے تو نہیں ہیں کہ حکومت جب ان سے ناراض ہو تو انھیں دو پاؤں پر چلنے والے جانوروں کے حوالے کر دیا جائے۔

جھوٹے مقدمات کا کالج

ظلم کی یہ چکی ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں اور کارکنوں پر چل رہی ہے۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ جھوٹے مقدمات کی بھرمار ہے، ایک ایک دولے میں دس دس مقدمات قائم کئے

جا رہے ہیں۔ ایک مقدمے میں ضمانت ہوتی ہے تو فوراً ہی دوسرے کسی مقدمے میں پھانس لیا جاتا ہے۔ پولیس جھوٹے مقدمے بنانے میں جتنی مشاق اب ہوتی ہے ماضی میں کبھی ایسی نہیں ہوئی تھی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی کالج ایسا کھول دیا گیا ہے جس میں پولیس اور انتظامیہ کے حکام کو جھوٹے مقدمات بنانے کا فن سکھایا جاتا ہے سچے مقدمے نہیں بنتے اگر جرم کا مرتکب سرکار رسیدہ ہو اور جھوٹے مقدمے ایک خودکار مشین کی رفتار سے بنتے چلے جاتے ہیں اگر قصوروار حزبِ اختلاف کا کوئی آدمی ہو یا آزادی پسند طلبہ کے گروہ سے تعلق رکھتا ہو، یہ انصاف کا قتل ہے، یہ لاقانونیت ہے۔ جمہوریت تو جمہوریت ایسی جگہ انسانیت بھی دم توڑ دیتی ہے، جہاں انصاف نہ ہو، جہاں قانون کی حکمرانی نہ ہو، جہاں اقتدار بالکل بے لگام ہو گیا ہو۔

مسودہ دستور۔۔نہ مکمل جمہوری، نہ مکمل اسلامی

اب اس کے بعد آپ دیکھیں کہ مسودہ دستور کی شکل میں کیا "تحفہ" قوم کو دیا گیا ہے۔ جب صدر صاحب برسرِ اقتدار آئے تو پہلے انھوں نے مارشل لا جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ پھر یکایک عبوری آئین لاکر قومی اسمبلی کے سامنے پیش کر دیا گیا اور قبل اس کے کہ اسمبلی کے ارکان اس کا مطالعہ کرتے، ان کو اس سوال سے دوچار کر دیا گیا کہ مارشل لا قبول ہے یا یہ جمہوری آئین؟ اس حالت میں ان کے لئے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ بے دیکھے اور بے سمجھے بوجھے عبوری آئین مان لیں کیونکہ دوسری متبادل صورت صرف یہ تھی کہ مارشل لا جاری رہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا یہی وہ جمہوریت ہے جسے اپنی سیاست قرار دینے کا نعرہ لگایا گیا تھا؟ یا کوئی جمہوریت پسند آدمی یہ کر سکتا ہے کہ قومی اسمبلی کے سر پر مارشل لا کی تلوار لٹکا کر اس سے یہ کہے کہ یہ تلوار اسی وقت تیرے سر سے اٹھ سکتی ہے جب کہ تو آنکھیں بند کر کے اس عبوری آئین پر انگوٹھا لگادے؟ یہ کام کوئی ایسا شخص نہیں کر سکتا جو ملک کا بھلا چاہتا ہو یہ تو وہی کر سکتا ہے جو ملک کا نہیں اپنا بھلا چاہتا ہو۔ اس غیر معمولی طریقہ پر ملک میں "جمہوریت" کی ابتدا کی گئی ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل آئین کا مسودہ اسمبلی کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ میں اس دستور پر زیادہ تفصیل سے بحث نہیں کروں گا۔ میں صرف ایک بات بھٹو صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر دستور یہ ہوا اور وزیر اعظم وہ خود نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہو تو کیا یہ دستور ان کو منظور ہوگا؟ میرا خیال ہے کہ اس صورت میں بھٹو صاحب سے بڑھ کر اس دستور کا مخالف اور کوئی نہ ہوگا، بلکہ میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ کہوں وہ اس کے خلاف تحریک چلانے کیلئے نکل کھڑے ہوں گے۔ اس سے پہلے ایوب خاں صاحب نے بھی یہی کیا تھا، انھوں نے بھی ۱۹۶۲ کا دستور اس بات کو سامنے رکھ کر بنایا تھا کہ صدر اس نظام میں وہ ہوں گے۔ آج اگر کوئی ایوب خاں صاحب سے قسم لے کر پوچھے کہ ۱۹۶۲ء کے دستور میں صدر تمھاری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا تم پھر بھی اس میں صدر کو وہ اختیارات دینے کے لئے تیار ہوتے جو تم نے اپنے لئے تجویز کئے تھے؟ تو زبان سے خواہ وہ کچھ ہی کہیں ضمیر ان کا پکار اٹھے گا کہ حاشا و کلا میں یہ اختیارات اپنے سوا کسی اور صدر کے لئے ہرگز تجویز نہ کرتا۔ یہی خصوصیات ہوتی ہیں اس دستور کی جو قوم اور اس کے مفاد اور عدل و جمہوریت کے اصولوں کو نظر انداز کر کے ایک فرد واحد کے اقتدار کی خاطر بنایا جاتا ہے۔ ایسا دستور نہ قوم کیلئے مفید ہوتا ہے نہ دیرپا ہو سکتا ہے۔ وہ فرد واحد کے لئے ہوتا ہے اور جب وہ فرد رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ اس کا دستور بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ایک پائیدار دستور وہی ہو سکتا ہے جو فرد کو نہیں بلکہ قوم کو اور اس کی ضروریات کو سامنے رکھ کر بنایا جائے۔ امریکہ کا دستور تقریباً دو سو سال سے چل رہا ہے۔ صدر پر صدر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کانگریس پر کانگریس آتی ہے اور رخصت ہو جاتی ہے۔ مگر دستور

اپنی جگہ قائم ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ ترمیمات بھی ہوئی ہیں، لیکن اس پورے عرصے میں ان کی تعداد ۲۵ کے لگ بھگ ہی رہی ہے کیونکہ اس دستور کو کچھ دیانتدار لوگوں نے قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر مستقل اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا تھا۔

ہمارے یہاں جو مسودۂ دستور پیش کیا گیا ہے یہ پارلیمانی نظام کے تقاضے بھی کسی طرح پورے نہیں کرتا۔ بھٹو صاحب خود پڑھے لکھے اور قانون داں آدمی ہیں وہ خود بھی پارلیمانی دستور کا مطلب سمجھتے ہیں اور دنیا میں لاکھوں آدمی دستوری قانون کے ماہر موجود ہیں۔ ہم جب اپنا دستور ان کے سامنے پیش کریں گے تو کیا وہ اس بات کو مان لیں گے کہ واقعی یہ ایک پارلیمانی دستور ہے، کون تسلیم کرے گا کہ یہ پارلیمانی سسٹم ہے؟ وہ لوگ ہمارے اوپر ہنسیں گے اور ہمارا مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ ہندوستان میں تو جمہوریت ہے جو ۲۵ سال سے ایک دستور پر چل رہی ہے مگر پاکستان میں جب کوئی جمہوری دستور بنتا ہے تو اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے اور جب کوئی طاقتور آدمی آتا ہے تو ملک کے لئے نہیں بلکہ اپنے لئے آمریت کا دستور بناتا ہے جس کے رخصت ہوتے ہی دستور بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے ہمسایہ ملک کے مقابلے میں بین الاقوامی پیمانے پر ہماری تذلیل ہو رہی ہے جس کی وجہ سے جمہوری ممالک میں بالعموم لوگوں کی ہمدردیاں ہمارے مقابلے میں ہندوستان کیساتھ ہوتی ہیں۔

اسلامی دستور کی بنیاد تو یہ ہے

اس دستور کے متعلق قوم کو یہ اطمینان بھی دلایا جا رہا ہے کہ یہ اسلامی دستور ہے، کیونکہ اس میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے اور پچھلے قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے اور آئندہ کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے خلاف نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن دستور میں اس امر کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف قوانین کے جاری رہنے اور نئی قانون سازی نہ ہونے کی روک تھام کیسے کی جائے گی۔ اس ضمانت کی غیر موجودگی میں اسے مشکل ہی سے اسلامی دستور مانا جا سکتا ہے۔ پاکستان کے اندر بھی علماء کی کمی نہیں ہے اور پاکستان کے باہر بھی علماء بکثرت موجود ہیں ان سے پوچھ لیجئے کہ جس شکل میں یہاں اسلامی دفعات شامل دستور کی گئی ہیں، کیا اس کو اسلامی دستور کی خصوصیت کا حامل کہا جا سکتا ہے؟

اسلامی دستور کی بنیاد تو یہ ہے:-

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول (النساء، آیت ۵۹)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اپنے اولی الامر کی پھر اگر تمہارے درمیان کوئی نزاع ہو تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف پھیر دو۔"

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس معاملے میں عوام کے درمیان یا انتظامیہ اور عوام کے درمیان یا مجلس قانون ساز اور عوام کے درمیان نزاع ہو تو اس کے فیصلے کیلئے خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے رجوع کیا جائے۔ یہ ہے اسلامی دستور کی پوری عمارت کا سنگ بنیاد۔ اس میں اولی الامر کی حیثیت انتظامیہ کو بھی حاصل ہے اور مقننہ کو بھی۔ ان میں سے کسی کے حکم یا وضع کردہ قانون سے قوم کو اختلاف ہو تو اس معاملے کو اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیرنے کی آخر کیا صورت ہے کیا اسے براہِ راست اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے یا رسولؐ پاک کے مزار مبارک پر لے جایا جائے؟ ظاہر ہے کہ آیت کا مدعا یہ نہیں ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ انتظامیہ اور مقننہ دونوں سے الگ ایک تیسرا ادارہ ایسا ہونا چاہئے جو غیر جانب دار ہو اور وہ خدا کی کتاب اور رسولؐ کی سنت سے یہ فیصلہ کرے کہ کوئی حکم یا قانون قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ ایسا ادارہ موجودہ حالات میں عدالت ہی ہو سکتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کے زمانے میں اس کی ضرورت نہیں پڑی، کیونکہ اس وقت جو اہلِ حل وعقد

خلفائے راشدین کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے۔ وہ سب دین کا علم رکھنے والے، متقی اور خدا ترس تھے۔ ان سے اس بات کا امکان ہی نہیں تھا کہ وہ سب مل کر قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون بنا دیں گے۔ یہ صورتِ حال اب نہیں ہے اس دور میں مقننہ کے ارکان کتنے دین دار اور خدا ترس ہیں۔ یہ تو تم نے خود مقدمے بنا بنا کر بتا دیا ہے، کسی پر تم نے بھینسوں کی چوری کا مقدمہ بنایا، کسی کو اغوا کے الزام میں پھانسا اور کسی پر قتل کا الزام لگایا۔ اس مقننہ کے ارکان جیسا کچھ علم دین رکھتے ہیں، اس کا حال بھی سب کو معلوم ہے۔ ان میں اگر کچھ عالمِ دین ہیں بھی تو قومی اسمبلی میں فیصلہ ان کے علم پر نہیں بلکہ ارکان کی اکثریت کی رائے پر ہوگا۔ اس کے بعد عدالت کے سوا اور کونسا ادارہ ایسا رہ جاتا ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے۔ اگرچہ سپریم کورٹ عدالیہ کے ارکان بھی عالمِ دین نہیں مگر عدالت کم از کم یہ تو کرے گی کہ دونوں طرف کے دلائل سنے گی اور ان کا تجزیہ کرکے بے لاگ فیصلہ دینے کی کوشش کرے گی۔

اس طرح سے موجودہ دستور نہ اسلامی ہے نہ جمہوری۔ دونوں حیثیتوں سے قوم کو دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ آپ اس کو اسلامی دستور کہہ سکتے ہیں لیکن دنیا علماء سے خالی نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ کتنا اسلامی ہے اور کتنا نہیں ہے۔ اسی طرح دنیا ماہرین آئین سے بھی خالی نہیں ہے۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ یہ دستور پارلیمانی جمہوری ہے یا نہیں؟

میں حکمرانوں سے کہتا ہوں کہ تم اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کی یہ تدبیریں چھوڑ کر سیدھی طرح انصاف کے ساتھ حکومت کرو اور دنیا میں جو مسلّم جمہوری طریقے ہیں ان کے مطابق دستور بنا دو۔ تم انصاف کرو گے تو انہی سیدھے اور صاف جمہوری طریقوں سے تمہارا اقتدار دائم ہو سکتا ہے اور تم مسلسل انتخابات جیت کر بار بار برسرِ اقتدار آ سکتے ہو۔ اقتدار کا دوام صرف آئینی پابندیوں پر موقوف نہیں ہے اور نہ انتخابات جیتنے کے لئے انتظامیہ کو استعمال کرنے اور دھونس اور دھاندلی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ جو خدا ترسی اور ایمانداری کے ساتھ قوم کی خدمت کرے گا وہ آپ ہی انتخابات جیت لیگا۔ اس قوم کو خواہ مخواہ اپنے حکام بدلنے کا شوق نہیں ہے لیکن آئین ایسا ہونا چاہئیے کہ جب قوم ان کو بدل کر دوسروں کو ان کی جگہ لانا چاہے تو بآسانی لا سکے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

نہایۃ التحقیق

اُردو شرح

مسند ابوبکر صدیق رضؓ

حدیث کی مشہور کتاب مسند احمد بن حنبلؒ کی عظمت و رفعت محتاجِ تعارف نہیں۔ اسمیں امام موصوف نے ہر صحابی کی روایات الگ الگ جمع کی ہیں۔ ابتدا ظاہر ہے ابو بکر صدیق رضؓ سے ہوگی۔ یعنی جو کلامِ مبارک حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ سب یکجا۔ خوشی کی بات ہے کہ ایک مستند اور دقیقہ رس عالم نے مسند احمد بن حنبل کی اُردو شرح کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور اسی سلسلے کی پہلی کڑی نہایۃ التحقیق کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ یہ بڑے سائز کے ۵۷ صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت صرف پندرہ روپے۔ بڑی اہم بات یہ ہے کہ فاضل شارح نے شروع کتاب میں ایک طویل مقدمہ دیا ہے جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اسمیں انھوں نے اُردو خواں طبقے کیلئے فنِ حدیث کی باریکیوں اور اصطلاحوں اور اصولوں کو پوری تحقیق کے ساتھ سپردِ قلم فرمایا ہے بلند پایہ کتابوں کا نچوڑ فنِ حدیث کی معلومات کا بیش بہا خزانہ۔ اُمید ہے کہ شائقین اس تحفۂ نادرہ سے فائدہ اٹھائیں گے۔

قیمت — پندرہ ۱۵/ روپے۔ مجلد سترہ ۱۷/ روپے۔

مکتبہ تجلّی - دیوبند (یو۔پی)

(از:۔ ملّا ابنُ العرب مکّی)

مسجد سے میخانے تک

دفعہ ۱۵۳ (الف)

خیر سے جس مبارک دفعہ ۱۵۳ (الف) کے طفیل تجلّی کے ایڈیٹر صاحب پچاس گھنٹے سے زیادہ جیل کی ہوا کھا آئے ہیں اور اب بھی مقدمات کا سایۂ شفقت ان کے سرِ نامبارک پر جوں کا توں موجود ہے اسی بابرکت دفعہ کا کچھ ذکرِ خیر ابھی ۲۵ر اپریل ۷۳ء کو لوک سبھا میں آیا تو وزارت اطلاعات و نشریات کے وزیر ریاست جناب گجرال نے بڑی دلچسپ باتیں کہیں۔ مثلاً فرمایا:۔

"اردو کے بعض اخبارات اور صحافیوں کی یہ
شکایت قطعی بے بنیاد نہیں ہے کہ ان کے ساتھ امتیازی
سلوک کیا گیا ہے اور ان پر مقدمات چلائے گئے ہیں"۔

یہ آنے والے الیکشن کی برکت ہو یا گجرال صاحب کی زندہ ضمیری کا کرشمہ۔ ہے بہرحال غنیمت کہ دبا بھنچا اور لطیف و نازک سہی مگر خطا کا اعتراف آ تو گیا ورنہ خوش تدبیر کی زبان پر وہ نہ اکثر حالات میں تو ہوتا یوں ہے کہ کرسی نشین بزرگ دو اور دو سات جوڑتے ہیں اور جب ان سے کہیے کہ حضور دو اور دو تو انگریز کے زمانے میں بھی سات نہیں ہوئے اب کیسے ہوں گے تو آنکھیں نکال کر جواب دیتے ہیں کہ تم فرقہ پرست ہو۔ وطن دشمن ہو۔ حکومت کو بدنام کرنا چاہتے ہو۔

خیر۔ مزید فرمایا:۔

"یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ ریاستی حکومتوں نے دفعہ
۱۵۳ (الف) کا غلط استعمال کیا ہے"۔

گویا استعمال غلط بھی نہیں ہوا اور مظلوموں کی بعض شکایات درست بھی ہیں کتنا شاندار علمِ کلام ہے بقول شاعر:۔

ایں وزیرے خوب داند جام و سنداں باختن

کمال یہ ہے کہ بقول مسٹر چندر ین ان مقدمات میں ۹۰ فیصدی ملزمین عدالتوں سے بری کر دیئے گئے۔ یہ کس بات کا ثبوت ہے؟ کیا اس بات کا کہ غریب اردو اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں اور مالکوں پر دفعہ ۱۵۳ (الف) کا تازیانہ ریاستی حکومتوں نے معقول وجوہ سے برسایا؟

یا اس بات کا کہ وجوہ اکثر و بیشتر نامعقول ہی تھے۔ محض دھاندلی اور دھونس کے طور پر پولیس وارنٹ لے دوڑی۔ بلا سے عدالتیں ملزموں کو بری کرتی رہیں دورانِ مقدمہ تو ایڈیٹر صاحبان کو چھٹی کا دودھ یاد آہی جائے گا۔ شرافت کا یہ عالم کہ ہتھکڑیاں بھی ضرور ڈالیں گے۔ یعنی اُردو اخبارات و رسائل کے ایڈیٹر خطرناک قسم کے ڈکیت ہیں، خونی ہیں، باغی ہیں کہ ہتھکڑی نہ ڈالی تو بھاگ ہی جائیں گے اور بھاگ کر ساتویں آسمان پر جا چڑھیں گے جہاں سے انھیں واپس لانا ناممکن ہوگا۔

کتنا مسرّت بخش اور روح پرور تھا وہ منظر جب ایک مرتبہ عین رمضان میں میاں ایڈیٹر تجلی کو یہ لوہے کا زیور پہنایا گیا۔ واہ واہ۔ قلم چلانے والے ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ کتنے خوش ہوئے ہوں گے ہتھکڑی پہنانے والے انسپکٹر صاحب کہ آج کیا ہے ہم نے کوئی کارنامہ۔ تھا بھی واقعی کارنامہ۔ ایک شخص جو ابھی بے قصور ہے مجرم نہیں اور جس کا گھر بار مع بال بچوں کے شہر ہی میں واقع ہے۔ اس کے بارے میں یہ ڈرنا کہ پھر سے اُڑ نہ جائے کارنامے کے سوا آخر کیا ہو سکتا ہے۔

خیر کارنامے تو ہر شخص کا پیدائشی حق ہیں لہٰذا ان پہ شکوہ کون کرے اور کیوں کرے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ فرمایا تو ہے جناب وزیر ریاست مسٹر گجرال نے:۔

> "حکومت سے جو شکایتیں کی گئی ہیں ان کی روشنی میں ریاستی حکومتوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی ہے۔"

وللہ عاقبۃ الامور۔

یہ مہذب اور ترقی یافتہ دنیا

بنگلہ دیش بننے سے پہلے جو کچھ ہوا وہ تو اب قصۂ ماضی بن چکا۔ قصۂ حال یہ ہے کہ جو مسلمان نسلاً بنگالی نہیں ہیں وہ چاہے کتنے ہی دنوں سے بنگلہ دیش کی سرزمین پر رس بس رہے ہوں انھیں بہرحال "بہاری" کا نام دے کر بنگلہ دیش سے نکالا جا رہا ہے۔ دوسری طرف مغربی پاکستان کا کوئی صوبہ انھیں اپنے یہاں قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ سندھی ہوں یا لاہوری سب یک زبان ہیں کہ ہمارے پہلو میں تو ایک بھی "بہاری" کی گنجائش نہیں۔ ہمارا اپنا دیس بھارت بھی بنگلہ دیش کے مجیب الرحمٰن سے یہ نہیں کہتا کہ "بہاریوں" کے حال زار پر رحم کرو۔ وہ برسوں سے اس سرزمین پر بس رہے ہیں جو پہلے مشرقی پاکستان کہلاتی تھی اور اب بنگلہ دیش کہلاتی ہے۔ انھیں بسنے دو۔ یہ تم سے بھیک نہیں مانگتے۔ وظائف نہیں طلب کرتے۔ اپنے ہاتھ پیروں کی محنت سے روٹی کھانا چاہتے ہیں۔ تم کیوں انھیں نکالنے کے درپے ہو۔

ہمارا دیس آخر کہے بھی کیوں۔ جب خود مجیب الرحمٰن صاحب مسلمان ہونے کا دعویٰ رکھتے ہوئے قرآن و حدیث سب بھول گئے اور اسلامی اخلاق و احکام کا کوئی سبق انھیں یاد نہ رہا اور جب لاہور و سندھ والے باوجود "مومن" ہونے کے دین و شریعت کے سارے تقاضے فراموش کر بیٹھے تو بھلا ہمارا اسیکولر دیس کس خوشی میں انسانیت و اخلاق کی غلامی کرے!

یہی ہے وہ سفاک اور بے رحم اور انسانیت کش اور غلیظ و متعفن زمانہ جسے خیر سے علم و سائنس اور عدل و جمہوریت اور روشنی و ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ہائے کیا اس سے بڑھ کر بھی تمسخرِ انسانیت سے کسی دور میں ہوا ہوگا؟

خوش فہمی

"دعوت" کے ایک اداریے سے:۔

> ..... لیکن ہم سمجھتے ہیں بلکہ پورا یقین رکھتے ہیں کہ اندرا جی کا ضمیر زندہ ہے۔"

بے شک سمجھنے اور یقین رکھنے پر کوئی ٹیکس نہیں۔ جو چاہے سمجھئے جیسا چاہے یقین رکھئے۔ بہتیرے لوگ آج بھی یقین رکھتے ہیں کہ دھرتی گائے کے سینگ پر قائم ہے اور چاند میں بڑھیا چرخا کات رہی ہے۔

مگر اے مدیرِ خوش تدبیر! ہم اندھوں کو بھی تو

اس بازار کا اتا پتا دیجئے جہاں انسانیت اور ضمیر کے مبارک چہرے دکھلانے والی عینکیں ملتی ہیں۔ ہم اندھے پوری دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا دیکھ رہے ہیں اور اس اندھیرے میں یوں لگتا ہے جیسے عفریت ناچ رہے ہوں۔ بھیڑیے اور چیتے قہقہے لگا رہے ہوں۔ انسانیت کسی بے بس دوشیزہ کی طرح ہوس کے انگاروں پر لوٹ رہی ہو۔ ضمیر کسی فاقہ کش مقروض کی طرح مہاجنوں کی ٹھوکروں میں کراہ رہا ہو۔

آپ اگلی ہی سطر میں یوں بھی فرماتے ہیں:-

"اسرائیل کو وجود بخشنے میں دنیا کی تمام بڑی طاقتیں شریک تھیں۔ امریکہ، روس، برطانیہ اور فرانس میں سے کسی کا دامن پاک نہیں۔"

پھر وہ انسانیت اور ضمیر کا جلوہ آخر کیا قطب شمالی کے برف زاروں میں یا افریقہ کے ریگزاروں میں جناب کو نظر آیا ہے؟

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

محاذ آزادیٔ فلسطین کے سربراہِ اعلیٰ یاسر عرفات کی زبان سے تحریک الفتح کا مقصد:-

"ہمیں ایک سیکولر جمہوریت اور ترقی پسند حکومت قائم کرنا ہے۔"

قائم کرسکیں گے یا نہیں کرسکیں گے یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے لیکن الفتح کے "مجاہدین" پر بڑا ہی رحم آتا ہے کہ اپنی جانوں کو انھوں نے کتنا سستا قرار دے لیا ہے۔ فرض کرو "مجاہدین الجزائر" کی طرح انھیں بھی لاکھوں جانیں قربان کرکے کبھی حکومت میسر آ ہی گئی تو کے دن مزے کریں گے وہ اس کے تختِ اقتدار پر۔ دس سال۔ بیس سال۔ بہت سے بہت تیس سال ـــ پھر وہی قبر اور عالم آخرت جو سب کے لئے مقدر ہے۔ آخرت میں تو بہر حال سیکولرازم اور ترقی پسندی کو تمغے اور خلعت ملنے سے رہے۔

عبرت کی جا ہے۔ عقیدہ یہ کہ قرآن سچا ہے۔ رسول سچا ہے۔ دینِ اسلام سچا ہے لیکن جدوجہد تمام تر حقیر دنیاوی متاع کے لئے۔ یہ جدوجہد بھی عینِ عبادت بن جاتی اگر ذہن کے کسی گوشے میں یہ جذبہ اور داعیہ موجود ہوتا کہ اقتدار اگر میسر آگیا تو ہم خدا کا قانون نافذ کریں گے۔ آخرت کا اجر تو نیتوں کے مطابق ہے۔ نیت اگر یہ ہے کہ اقتدار میسر آنے پر سیکولرازم کا جھنڈا لہرایا جائے گا اور ترقی پسندی کی ڈگڈگی بجائی جائے گی تو پھر خود ہی گویا خدا سے یہ کہہ دیا کہ آخرت واخرت ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ ہمارے لئے تو یہ دنیا ہی سب کچھ ہے۔

اپنے گھر، اپنے ساز و سامان اور اپنی آزادی کیلئے غاصب اور ظالم سے لڑنا بے شک "جہاد" ہی کی ایک قسم ہے لیکن ارادہ اگر یہ ہو کہ اختیار میسر آجانے پر طاغوتی قوانین کا اجراء کیا جائے گا تو کوئی جاہل ہی یہ توقع کرسکتا ہے کہ سچ مچ یہ وہ جہاد ہے جس کے بدلے جناتِ نعیم کی بشارت دی گئی ہے۔

درمیانِ قعرِ دریا.....

انٹرنیشنل سینٹر کے تحت دہلی میں ابھی عورتوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں خواتین کی رائے کا خلاصہ:-

"جب تک مردوں کے سماجی رجحانات میں تبدیلی واقع نہیں ہوگی عورتیں اپنی حرمت اور عزت کو باقی نہیں رکھ سکیں گی۔"

تعجب ہے خواتینِ محترم کو وہ تبدیلیاں نظر نہیں آرہی ہیں جو مردوں کے سماجی رجحانات میں تیزی سے واقع ہوتی چلی جارہی ہیں۔ عظیم تبدیلیاں جنھیں اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ کل شاگرد استاد سے ڈرتے تھے آج استاد شاگردوں سے کانپتے ہیں۔ کل گانا ناچنا پیشہ وروں کا کام تھا آج یہ عین تہذیب و ترقی کی نشانی ہے۔ کل عشق بازی چھپ کر ہوتی تھی۔ آج کھل کر اور ڈٹ کر ہوتی ہے۔

اکیلا سنیما مردوں اور عورتوں دونوں کے سماجی رجحانات میں جو تیز تر تبدیلیاں لا رہا ہے وہ شیطانوں کا پورا لشکر بھی نہیں لا سکتا۔ حیا، ادب، انسانیت، پرہیزگاری

اور ہر وہ قدر دم توڑ رہی ہے جو نقد نفع نہیں دیتی۔

امید ہے یہ تبدیلیاں ابھی بہت آگے بڑھیں گی، اور رفتہ رفتہ ہم مشرقیوں کو بھی یہ فلسفہ اختیار کرنا پڑیگا کہ عصمت وعفت ایک وہم ہے جسے خواہ مخواہ دل ودماغ پر مسلط کرلیا گیا ہے۔ دوسرے تمام دائروں کی طرح جنس کے دائرے میں بھی مرد وزن کو ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہیئے۔

ایک دیوی صاحبہ نے فرمایا:۔

"عورتوں کی بے حرمتی اور ان کی طرف دست درازی صرف شہروں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ وبا دیہات میں بھی پھیل چکی ہے۔"

بزرگوں نے کہا ہے کہ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ لے معزز دیوی! تین اور تین یا تو چھ ہوتے ہیں یا تینتیس ۳۳۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتے۔ آپ چاہتی ہیں کہ بیج ایلو کے ڈالے جائیں اور فصل اُگے انگور کی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے مرد عورت کے اختلاط والی جو تہذیب آپ نے قبول کی ہے، رہن سہن کا جو طریقہ آپ نے اختیار فرمایا ہے، زندگی کی جو قدریں آپ نے پسند کی ہیں ان کا توحاصل بہر صورت یہی ہونا ہے جو ہو رہا ہے۔

ایک بہت ہی عقل مند شخص کی کہانی بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ ناک پر بیٹھنے والی مکھیوں سے وہ تنگ آگیا تھا۔ ایک دن اس نے ناک ہی صاف کردی کہ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ نہ ہوگی ناک نہ بیٹھے گی مکھی۔

ٹھیک اسی طرح دریا میں اُترکر کپڑے بھیگنے کی ترکیب بس ایک ہی ہے یہ کہ کپڑے اُتار دیئے جائیں اور بھلا دیا جائے کہ ننگا پن بھی کوئی عیب ہے۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ ایک طرف آپ دیویاں یہ آرزو رکھتی ہیں کہ مرد کے اندر چھپا ہوا نفسانیت کا دیو کسی سعادت مند بچے کی طرح معصومیت کی نیند سویا رہے اور دوسری طرف اپنے ملبوسات اور میک اپ کے ذریعہ آپ اس دیو کو کچوکے بھی دیتی ہیں کہ اے مستِ خواب!

اُٹھ بیٹھ۔ آنکھیں کھول کر ذرا ہمیں بھی تو دیکھ۔

لطف یہ ہے کہ جو بے چاریاں ابھی تک برقعے کی دقیانوسیت سے نہیں نکل پائی ہیں انھوں نے برقعوں ہی کو اتنا سجالیا ہے کہ اندھے بھی ایک دفعہ تو آنکھیں ضرور پھیلادیں۔

نہیں اے ماؤ بہنو بیٹیو۔ آگ سے ٹھنڈک اور برف سے حرارت کبھی نہیں ملے گی۔

اور یہ جو کسی قابل بہن نے اظہار رائے فرمایا کہ:۔

"اسکولوں اور کالجوں میں عورتوں اور مردوں کو اختلاط کی آزادی تو حاصل رہے مگر یہ اختلاط کنٹرول سے باہر نہ ہونے پائے۔"

تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہوا میں گرہیں لگانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ موٹروں، سائیکلوں اور اسکوٹروں میں تو بے شک بریک ہوتے ہیں اور حسب ضرورت گھمانے پھرانے کا بھی انتظام ہوتا ہے لیکن آدم زاد کی نفسانی خواہشات اور فطری تقاضوں پر کون بریک لگائے گا جب کہ سیکولرازم اور سوشلزم وغیرہ نے دین دھرم کا قصہ ہی تمام کردیا۔

اخلاق کا واحد سرچشمہ مذہب ہے۔ مذہب کو طاق میں رکھ کر یا محض ڈرائنگ روم کی زینت بناکر یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ مردوں کے سماجی رجحانات میں وہ مقدس تبدیلیاں ظہور پذیر ہوں گی جن کی ہماری دیویاں آرزو کررہی ہیں۔

توقعات کا خون

فرمایا ہماری بہت ہی اچھی وزیر اعظم اندرا جی نے:

"کسانوں سے جو توقعات تھیں وہ انھوں نے پوری نہیں کیں۔"

یہ تو پرانی ریت ہے بہن جی۔ کون کس کی توقعات پوری کرتا ہے۔ ہم سب نے آزادی سے کیا کیا توقعات باندھی تھیں۔ دودھ اور گھی کی نہریں جاری ہوں گی۔ ہر چیز

سستی ملے گی۔ مزا آجائے گا۔ سبحان اللہ۔
اور ابھی چند ہی روز کی تو بات ہے بے چارے مسلمانوں نے آپ سے کتنی خوشنما توقعات باندھی تھیں کس ذوق شوق سے ووٹ دیئے تھے کہ اپنی اندرا جی کی پارٹی مالکُ الملک بن گئی تو سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ پرا دی اک دم چین لکھے گا۔ جان مال عزت آبرو کا جتنا نقصان اب تک اٹھایا ہے اس کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے گی ۔۔ مگر۔

جب کھلی آنکھ تو سویرا تھا
سخت شرمندگی نے گھیرا تھا

آپ ہی سوچئے۔ ہم کہیں گے تو شکایت ہوگی!
عوام نے آپ سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ تورا غلے کی تجارت کو قبضے لیجئے ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ نے ان سے جو بھی توقعات باندھیں ان پر ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس کے برخلاف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آپ نے خود ہی کچھ توقعات بندھائی تھیں اور آپ کے حلقہ بگوشوں نے ڈھن کے چوک وعدہ کیا تھا کہ آنے والا ایکٹ مسلمانوں کے جذبات وخواہشات کی تکمیل کرے گا۔ پھر آپ ہی نے ان توقعات کے ہوائی محل پر ایسی کس کے ٹھوکر ماری جیسی فٹ بال کا کھلاڑی گیند پر کک مارتا ہے شکوہ کچھ نہیں۔ ہمیں تو ہمارے اللہ میاں نے بتا دیا ہے کہ کُلٌّ یَّعمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ۔ آپ کے لئے البتہ بڑی سوچ کا مقام ہے کہ اب اس دیس کا کیا بنے گا جہاں گھی دودھ آٹا دال سب اتنی افراط سے ہر طرف پھیل گیا ہے کہ لوگوں کو پیر پھیلانے کی جگہ نہیں مل رہی ہے اور بہتیرے اللہ کے نیک بندے سوچ رہے ہیں کہ کیوں نہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھود کر اس میں جا سوئیں تاکہ کم سے کم پیر پھیلانے کی آسانی تو میسر آہی جائے۔
ویسے شاعر لوگ بعض دفعہ بڑے غضب کے شعر کہہ دیتے ہیں۔ دیکھئے کیا کہا ہے:۔
آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں + تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

حکومت کی فراخ دلی!

دعوت کے ایک اداریے سے:۔
" حکومت نے یہ اعلان کر کے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا ہے کہ اگر خود مسلمان ہی مطالبہ کریں گے تو مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کی جائے گی اور اس کی جگہ سول کوڈ لایا جائے گا"

"فراخ دلی" کا لفظ ہلکا ہے۔ احسانِ عظیم یا کرم بے پایاں جیسا کوئی لفظ استعمال کیا جاتا تو حکومت زیادہ خوش ہوتی کہ دیکھو ایسے ہوتے ہیں شکرگذار بندے۔
حکومت کی فراخدلی ـــ اللہ اکبر۔ گائے نہ سہی بھینس تو کھانے کو مل ہی رہی ہے۔ کنٹرول رہا ہے مرغیوں اور بٹیروں تک پر کوئی پابندی نہیں۔ حکومت اگر فراخ دل نہ ہوتی تو وہ کہہ سکتی تھی کہ فقط دال کھاؤ۔ ترکاریاں کھاؤ۔ ہوا کھاؤ۔ گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔
مسجدیں سلامت ہیں۔ نماز و اذان کی بھی اجازت ہے۔ نکاح و طلاق میں بھی کم سے کم ابھی تک حکومت کا دخل نہیں۔ کیا کیا آزادیاں ہیں جو ہمیں اپنی جمہوری حکومت میں ملی ہوئی نہیں ہیں۔ یہ سب حکومت کے قلبِ فراخ ہی کا تو ثبوت ہیں۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ابھی تک زمین ہی پر ہے۔ فرقہ پرست شور مچا رہے ہیں کہ یونیورسٹی تباہ کر دی گئی۔ ان احمقوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ یونیورسٹی کی ایک ایک عمارت بلکہ ایک ایک دیوار اپنی جگہ قائم ہے۔ ایک اینٹ تک حکومت نے اپنی جگہ سے نہیں سرکائی۔ حالانکہ وہ اگر بے حد فراخ دل نہ ہوتی تو یونیورسٹی کی ساری عمارتوں ہی کو زمیں بوس کر دینے سے اسے کون روک سکتا تھا۔ فراخ دلی کی حد ہے کہ اس نے یونیورسٹی بند کی تو بے حد شرافت سے طلباء کو اذن دیدیا کہ چین آرام سے اپنے گھر جاؤ۔ حالانکہ بلا شبہ اس کے پاس وہ فوج ظفر موج موجود تھی جس نے مشرقی پاکستان کو کامیابی کے ساتھ

بنگلہ دیش کا روپ دیا تھا اور آج بھی تقریباً نوے ہزار قیدی اس کے قبضے میں ہیں۔ وہ اگر چاہتی تو طلباء کا بنارس اور فیروز آباد بھی بنا سکتی تھی۔

مسلمانوں کے پرسنل لا کا گلا گھونٹنے کے لئے یہ اطمینان دلانا کہ خود مسلمانوں کے مطالبے کے بغیر ہم یہ ہتھیا نہیں کریں گے فراخ دلی کی وہ قسم ہے جس پر بقول شاعر:-

جی چاہتا ہے ہدیۂ جاں پیش کیجئے

غالب زندہ باد

ایک خبر کا عنوان:-

"لاکھوں شنکروں کو سرکار کی ناکارہ پالیسی نے موت کے گھاٹ اُتار دیا"

بہت خوشی کی بات ہے۔ موت سارے آلام و افکار کا قصّہ تمام کر دیتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھیں آزادی اور جمہوریت کے اس دورِ سعید میں آسانی سے موت جیسی نعمت میسر آ جائے۔

آفت تو ان بدنصیبوں کی ہے جو بقول شاعر:-

انگشتِ حیرت درد ہاں نیمے دروں نیمے بروں

کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ غالب نے اپنے محبوب کے بارے میں کہا تھا:-

مرے دل سے کوئی پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں کی ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہی حال ہماری محبوب کانگریسی حکومت کا بھی ہے۔ ظالم نگاہِ ناز کے تیر اس انداز میں چلا رہی ہے کہ دل و جگر کا قیمہ تو نہ بننے پائے مگر تھوڑی تھوڑی نوکیں اندر اُتر جائیں۔ اس طرح غالب علیہ الرحمتہ کے ایک نیم اردو اور نیم ایرانی شعر کو نئی زندگی نصیب ہو گئی ہے۔

فرمایا تھا:-

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل
تماشائے بجوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

گذشتہ سے پیوستہ سال مولانا قطب علی کا خیال تھا کہ یہ شعر مہمل ہے۔ اب وہ بھی کہنے لگے ہیں کہ اس کا کچھ نہ کچھ مطلب ضرور ہے۔ میں نے سوال کیا کہ خیال مبارک کی اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟

کہنے لگے کہ پہلے ہماری آمدنی اچھی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ کس چیز کا بھاؤ بڑھا کس چیز کا ملنا دشوار ہوا۔ اب آمدنی کم ہو گئی ہے اور گرانی کا بوجھ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا غلطیدن بھی برحق اور مرغِ بسمل بھی برحق ہے۔

میں نے کہا کہ غالب کا ایک اور شعر سماعت فرمائیے۔ آنکھیں نکال کر بولے کہ خبردار شعر دیر پڑھا تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا۔ پہلے ایک کلو گھی بازار سے لا کر دو تب شعر سنانے کی اجازت مل سکتی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ آپ ایک کلو کہتے ہیں۔ بیوی کل سے فقط ڈھائی سو گرام کا تقاضا کر رہی ہے۔ وہ بھی بازار میں میسر نہیں آیا۔ آپ اگر صرف دو سو گرام دلوا دیں تو پورا دیوانِ غالب میرے سر پر دے ماریئے گا۔ کہنے لگے جاؤ میاں جاؤ۔ تم ہی جیسے شیطانوں کی بد اعمالیوں سے یہ تباہی آ رہی ہے۔ ہم تو اب تبلیغی جماعت میں نکل جائیں گے۔ جہنم میں جائے یہ دنیا اور اس کے جھگڑے۔

یاد رکھیے

اگلا شمارہ "ایمان نمبر" ہوگا

انشاء اللہ جولائی ۷۳ء کے آخری ہفتے میں یہ منظرِ عام پر آ جائے گا۔ سالانہ خریداروں کو ان کے چندے ہی میں پیش کیا جائے گا۔

جو خریدار اسے رجسٹری سے منگانا چاہیں وہ منی آرڈر سے ڈیڑھ روپیہ جلد از جلد ارسال فرما دیں۔

منیجر تجلی

آنکھوں کے لئے

سرمہ دُرِّ نجف

سے بہتر کوئی چیز نہیں
آپ اسے روز کا معمول بنائیے!
بینائی انشاء اللہ آخر عمر تک محفوظ رہے گی۔
ایک تولہ سات روپے • چھ ماشے چار روپے (ڈاک خرچ دو روپے آٹھ آنے ۲/۵۰)
کوئی سی تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف
دار الفیض رحمانی۔ دیوبند (یو۔پی)

آپ کے بچّہ کے لیے پیٹ کی خرابیوں سے بچے رہنے کا
ایک ہی قدرتی ذریعہ
ہمدرد گرائپ واٹر

ہمدرد گرائپ واٹر میں پانچ قدرتی اجزا
شامل ہیں جو آپ کے ننھے بچّے کے
نازک نظامِ ہضم کو درست
کرتے ہیں اور پیٹ کی خرابی،
درد، اپھارا اور دستوں کی
تکلیف میں مکمل آرام دیتے ہیں

ہمدرد

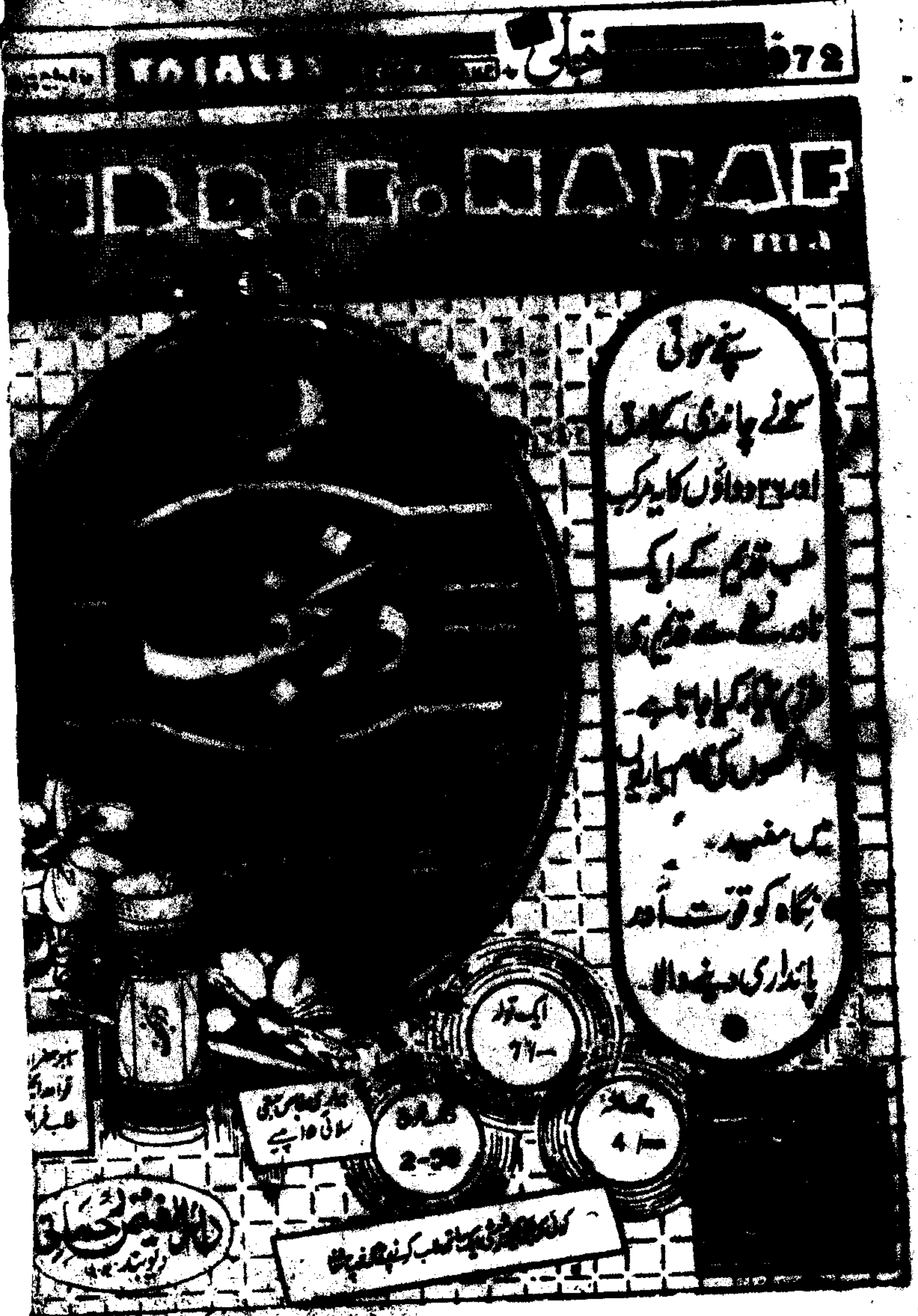
سنہری
نگاہ کو قوت اور
پائداری دیتا ہے